بحکم خدا و خرد

Ex Libris

Asaf Ali-Asghar Fyzee

Presented to the Library of
The University of Jammu & Kashmir
June 1, 1957

4-10

4-10

4-10

4-10

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

یہ رسالہ عجالہ موسومہ بہ

جمعِ قرآن

مؤلفہ

...ن حضرت مولانا مولوی محمد علی صاحب ایم، اے۔ امیر
جماعت احمدیہ لاہور۔ مصنف تفسیر بیان القرآن و انگریزی
ترجمۃ القرآن۔ النبوۃ فی الاسلام۔ مقام حدیث وغیرہ وغیرہ

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور

نے

باہتمام ماسٹر فقیر اللہ صاحب مہتمم تصنیفات گیلانی پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا۔

تعداد طبع ۱۰۰۰
بار دوم
قیمت ۱۲ / ار

فہرست مضامین جمع قرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

جمع قرآن

(۱) قرآن کریم کیلئے حفاظت الٰہی کا وعدہ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ (سورۃ الحجر آیت ۹)

ترجمہ۔ اس قرآن کو ہم نے (محمد ہی پر) اتارا ہے اور اس کی حفاظت ہم خود ہی کریں گے

حفاظت قرآن کے متعلق عیسائیوں کا اعتراف

قرآن کریم کی حفاظت کا وعدۂ الٰہی جو آیت مندرجہ عنوان میں دیا گیا ہے۔ جس عظمت اور صفائی کیساتھ اُس کے پورا ہونے کی حقیقت دنیا پر آج تک ثابت اور ظاہر ہوئی ہے وہ ایسی روز روشن کی طرح چمکتی ہے۔ کہ بڑے بڑے مخالفانِ قرآن کریم بھی اس کی واقعیت اور حقیت پر بیساختہ شہادت دے اٹھے ہیں ہم اس جگہ ایک مخالف کے الفاظ ہی نقل کرنے پر کفایت کریں گے جس کا نام سر ولیم میور ہے۔ اور جس نے اسلام کی مخالفت کے لئے کتاب لائف آف محمد لکھی۔ اور شایع کی تھی۔ اس کتاب کے دیباچہ کے صفحہ ۲۱ (طبع سوم) پر اُس نے قرآن کریم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ "جہاں تک ہمارے معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو اس (قرآن کریم) کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو"

اور پھر ایک دوسرے عیسائی دان ہیمر کا قول نقل کرتا ہے کہ "ہم ایسے ہی یقین کیساتھ قرآن (شریف) کو بعینہٖ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ مسلمان اسے خدا کا کلام سمجھتے ہیں۔ جس میں صاف اعتراف اس بات کا پایا جاتا ہے۔ کہ جو قرآن شریف اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ بلا کم و کاست وہی قرآن کریم ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ اور اس کی کسی عبارت یا کسی لفظ میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی۔

وعدہ حفاظت اور الذکر سے مراد

یہاں خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ کون سے اسباب اور حالات تھے۔ جن کی وساطت سے یہ مقدس ترین کتاب ہمیں بغیر کسی تحریف اور آمیزش کے ٹھیک اسی طرح پہنچی جس طرح ہمارے سید و مولیٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم پر نازل ہوئی تھی۔ ان اسباب کا تعلق مذہب اسلام کی تاریخ کے دو مختلف زمانوں کے ساتھ ہے۔ یعنی اول زمانۂ حیات نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور دوسرا زمانۂ خلفائے راشدین جنہوں نے کمال دیانت اور امانت کے ساتھ اس مقدس کلام کو آئندہ نسلوں تک ٹھیک اسی طرح پہنچایا۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے چھوڑا تھا۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی لاہور کی طرف سے ایک کتاب مسمی بہ تاویل القرآن اردو زبان میں شایع ہوئی تھی۔ جس کے مصنف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ اس کتاب میں گمنام مصنف نے آیت مذکورہ عنوان کے متعلق بھی خامہ فرسائی کرنے کی جرات کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس آیت میں الذکر سے مراد مطلق قرآن شریف نہیں۔ بلکہ تمام کتب سماوی مراد ہیں۔ پس ان اسباب کو بیان کرنے سے پہلے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مصنف تاویل القرآن کی غلطی کو ظاہر کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ لفظ ذکر جیسا قرآن شریف کے لئے بولا گیا ہے۔ دوسری کتب سماوی کے لئے بھی بولا گیا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے۔ کہ آیا اس خاص موقعہ پر جہاں آیت زیر بحث میں یہ لفظ آیا ہے۔ وہاں مراد اس سے قرآن کریم ہے۔ یا جملہ کتب سماوی۔ سو خود قرآن کریم کے پڑھنے سے اور آیت زیر بحث کے ماقبل اور مابعد پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ آیت مذکورہ سورہ حجر کی نویں آیت ہے۔ اور سورۂ شریفہ ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ اور پھر چھٹی آیت سے آیت زیر بحث تک کلام الٰہی میں یوں وارد ہوا ہے۔ وقالوا یاایها الذی نزل علیه الذکر انك لمجنون لوما تاتینا بالملٰئکة ان کنت من الصٰدقین ما ننزل الملٰئکة الا بالحق وما کانوا اذا منظرین۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحٰفظون۔ ترجمہ اور کافروں نے کہا کہ اے شخص جس پر الذکر اُتارا گیا ہے۔ تُو تو دیوانہ ہے۔ اگر تو سچا ہے تو فرشتوں کو ہمارے سامنے کیوں نہیں لا کھڑا کرتا۔ ہم فرشتوں کو نہیں بھیجا کرتے۔ مگر فیصلہ کے لئے اور جب فرشتے نازل

ہونگے تو) پھر اُن کو مُہلت بھی نہ ملے گی۔ بیشک ہم ہی نے الذکر کو اُتارا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت بھی کریں گے ۔ ان چار آیتوں میں دو جگہ لفظ الذکر آیا ہے۔ اور سلسلہ کلام سے ظاہر ہے کہ جو کچھ الذکر سے پہلی یعنی چھٹی آیت میں مراد ہے۔ وہی مراد آخری یعنی نویں آیت یا آیت زیر بحث میں ہے۔ لیکن پہلی جگہ لفظ الذکر سے صاف مراد قرآن شریف ہے۔ وہی قرآن مبین جس کا ذکر شروع سورہ میں ہے کیونکہ کافروں کا خطاب صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ الذی نزل علیہ الذکر سے یقیناً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ پس الذکر سے مُراد قرآن شریف ہی ہُوا نہ جُملہ کتب سماوی۔ اور یہی مراد اس لفظ سے دونوں جگہ ہے۔ اسی بات کی تائید قرآن کریم کی اور آیات سے بھی ہوتی ہے مثلاً سورہ حم السجدہ کی آیات ۴۱-۴۲ میں بعینہٖ اسی مضمون کو دہرایا گیا ہے۔ ان الذین کفروا بالذکر لما جاءھم وانہ لکتاب عزیز۔ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔ ترجمہ جن لوگوں کے پاس الذکر (یعنی قرآن) آیا۔ اور انہوں نے اسکو نہ مانا۔ (وہ بھی اپنا انجام کار دیکھ لیں گے) اور یہ (قرآن) تو بڑے پایہ کی کتاب ہے۔ کہ جھوٹ نہ تو اُس کے آگے (ہی کی طرف) اُس کے پاس پھٹکنے پاتا ہے۔ اور نہ اُس کے پیچھے (کی طرف) سے (کیونکہ) حکمت والے سزاوار حمد (وثنا یعنی خدا) کی اتاری ہوئی ہے۔ ایسا ہی اور بھی کئی آیات ہیں۔ جو صاف طور سے اعلان کر رہی ہیں۔ کہ قرآن شریف میں شروع سے ہی یہ الٰہی وعدہ ہے۔ کہ خدا تعالیٰ اس کو ہر قسم کی تحریف۔ آمیزش تغیر و تبدل اور بربادی سے ہمیشہ کیلئے محفوظ رکھے گا۔

حفاظت قرآن پر ابتدا سے اہل اسلام کا ایمان

ابتدائی زمانہ سے ہی مسلمانوں کا یہ اعتقاد چلا آتا ہے کہ ان آیات میں خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کو ہر قسم کے حملوں اور تصرف سے محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ حضرت مجاہد اور قتادہ جو تابعین میں سب سے پہلے مفسران قرآن ہیں۔ وہ بھی اس پر اتفاق رکھتے ہیں۔ کہ آیت انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحٰفظون اور آیت لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید سے یہی مطلب ہے کہ اس کلام پاک میں کوئی ایسا لفظ نہیں ڈالا جائیگا جو کلام الٰہی نہ ہو۔ اور نہ ہی کوئی حصہ کلام الٰہی اس میں درج ہونے سے رہ جائیگا۔ یا درج ہونے کے بعد نکالا جاسکیگا۔ ایسا ہی یہ دونوں بزرگ اور اُن کے علاوہ تمام مفسرین قرآن کریم اس بات پر متفق ہیں کہ الذکر سے مراد ان دونوں آیات میں قرآن کریم ہی ہے۔ دیکھو تفسیر ابن جریر جلد ۱۴ صفحہ ۶ و جلد ۲۴ صفحہ ۷۱-۷۲۔ غرض یہ ایک بیّن اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم کے پہلے اور پچھلے مفسرین حفاظت قرآن کریم کے متعلق وہی اعتقاد رکھتے تھے۔ جو آج کل مسلمانوں میں متفقہ طور پر مروج و مسلم ہے۔ اور اس امر کی کافی شہادت موجود ہے

اب ایسی صریح اور ثابت شدہ حقیقت پر جو آفتاب نصف النہار کی طرح چمک رہی ہے۔ بے اعتباری کا پردہ ڈالنا ایک بیہودہ اور احمقانہ کوشش نہیں تو اور کیا ہے +

ایفائے وعدہ کے ثبوت

مصنف تاویل القرآن نے یہ بھی لکھا ہے کہ کسی وعدے کا وجود اس بات کو ثابت نہیں کر سکتا کہ اسکا ایفا بھی ہوگیا۔ اور اس لئے وعدہ خود ثبوت نہیں ہو سکتا۔ اُن کے اس خیال کے ساتھ تو ہم اتفاق کرتے ہیں۔ لیکن انہیں اس بات پر غور کرنا چاہئے۔ کہ اس وعدے کے ساتھ ایسے واقعات موجود ہیں جن پر نگاہ انصاف ڈالنے سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے۔ کہ اس وعدہ کا ایفاء نہایت صفائی اور عُمدگی کے ساتھ ہوا ہے۔ کیونکہ اگر یہ وعدہ پورا نہ ہوا ہوتا۔ اور قرآن کریم میں کسی قسم کا تغیر و تبدل داخل ہو گیا ہوتا۔ تو ان دو باتوں میں سے ایک ضرور واقع ہوتی یعنی یا تو جن لوگوں نے ان تصرفات و تغیرات کو دیکھا تھا یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم وہ اس کے کلام الٰہی ہونے کا انکار کرتے یا ان آیات بینات کی جن میں حفاظت قرآن کا وعدہ ہے۔ موجودہ تفسیر کے سوا کوئی اور تعبیر و تاویل کرتے۔ لیکن یہ یقینی اور قطعی بات ہے کہ اس وجہ پر کسی نے قرآن شریف کے کلام الٰہی ہونے سے انکار نہیں کیا۔ اول تو ارتداد ہی شاذ و نادر تھا۔ مگر اس بنا پر کہ یہ وعدہ پُورا نہیں ہوا۔ کوئی بھی مرتد نہیں ہوا۔ اور نہ کسی صحابی نے آیات وعدہ حفاظت قرآن کی کوئی اور تفسیر یا تاویل کی۔ بلکہ سب کے سب بالاتفاق اسی اعتقاد پر جمے رہے۔ اور ایک صحابی کا نام بھی نہیں بتایا جا سکتا۔ جس نے ان دو شقوں میں سے کوئی ایک اختیار کی ہو۔ بلکہ جن معنوں کا پتہ ہمیں تابعین سے ملتا ہے جن کے معلم اجلہ صحابہ تھے وہ وہی معنے ہیں جو ہم نے اوپر اختیار کئے ہیں۔ اور جن کی بنا پر شروع سے لیکر آج تک تمام مسلمان قرآن کی حفاظت کے الٰہی وعدے کو سچا یقین کرتے چلے آئے ہیں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان لفظوں کے یہی معنی کرتے تھے۔ ان کے سوا کوئی اور مطلب ان الفاظ کا اُن سے کہیں ثابت نہیں۔ اگر وہ ان الفاظ کے کوئی اور معنی کرجاتے تو ضرور تھا کہ وہ ہم تک بھی پہنچتے۔ جیسا کہ ایک اور پیشگوئی کی تفسیر اور معنی بیان کرنے میں ہوا۔ اور وہ واقعہ یہ ہے۔ کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کو مخاطب کرکے فرمایا۔ اسرعکن لحوقابی اطولکن یدا جس کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ تم میں سے مجھے وفات پاکر وہی پہلے ملے گی جس کے لمبے ہاتھ ہیں۔

اطولکن یدا کی پیشگوئی اور اس کی تاویل

چنانچہ وہ حدیث جو صحیح مسلم میں بروایت حضرت عائشہ ام المومنین درج ہے۔ ذیل میں نقل کی جاتی ہے
عَنْ عائشۃ اُمّ المؤمنین قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسرعکن لحوقابی اطولکن یدا فکن یتطاولن ایتھن اطول یدا قالت فکانت اطولنا یدا زینب لانہا کانت تعمل بیدھا وتصدق ترجمہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا۔ کہ تم میں سے مجھ کو جلدی وہ ملے گی جس کے ہاتھ لمبے ہیں۔ حضرت عائشہ نے فرمایا۔ یہ بات سنکر تمام ازواج مطہرات اپنے اپنے ہاتھ اس بات کے دریافت کرنے کے لئے ناپنے لگیں کہ کس کے سب سے لمبے ہاتھ ہیں۔ پھر آخر کار زینب کے ہاتھ اس کی سخاوت کی وجہ سے اس حدیث کے منشا کے مطابق سب سے لمبے ثابت ہوئے"۔ ان مقدس بیبیوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سُن کر اُس کے یہی معنی سمجھے کہ گویا اس سے مراد جسمانی طور پر لمبے ہاتھ ہیں۔ اور اسی لئے غلط فہمی سے ایک دوسرے سے ہاتھوں کو ناپنا شروع کر دیا۔ لیکن احادیث کی کتابیں ایسی احتیاط اور امانتداری سے لکھی گئی ہیں کہ کسی قسم کی رعایت کے بغیر تمام امور کو درج کر دیا گیا ہے۔ اُن کی یہ غلطی بھی حدیثوں میں صاف طور پر درج ہے۔ اور اُس کے صحیح معنی بھی کھلے طور پر لکھے ہوئے موجود ہیں۔ چنانچہ امام نووی نے اس حدیث کے معنی یہ لکھے ہیں۔ معنی الحدیث انھن ظنن ان المراد بطول الید طول الید الحقیقۃ وھی الجارحۃ فکن یذرعن ایدیھن بقصبۃ فکانت سودۃ اطولھن جارحۃ وکانت زینب اطولھن یدا فی الصدقۃ وفعل الخیر فماتت زینب اولھن فعلموا ان المراد طول الید فی الصدقۃ والجود قال اھل اللغۃ یقال فلان طویل الید وطویل الباع اذا کان سمحا جوادا۔ یعنی اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ حضرت رسول کریم صلعم کی بیویوں نے یہی سمجھا تھا کہ لمبے ہاتھوں سے مراد فی الحقیقۃ ظاہری طور پر لمبے ہاتھ ہی ہیں۔ اور اس لئے انہوں نے اپنے ہاتھوں کی لمبائی کو ناپنا شروع کر دیا۔ ناپنے سے معلوم ہوا کہ آنحضرت کی بیوی سودا کے ہاتھ سب سے لمبے تھے۔ اور حضرت زینب صدقہ وخیرات میں سب سے کھلا ہاتھ رکھتی تھیں۔ اور وہی سب سے پہلے فوت ہوئیں۔ اس وقت اُن کو معلوم ہو گیا۔ کہ اس حدیث کے اصل معنی یہ تھے کہ لمبے ہاتھوں سے مراد سخاوت اور خیرات اور صدقہ میں سب سے سبقت اور فوقیت تھی۔ اہل لغت ایسے فقرات کے یہی معنی کرتے ہیں۔ چنانچہ جب کہتے ہیں کہ فلان طویل الباع یا فلان طویل الید تو اس سے یہی مراد ہوتی ہے کہ فلاں شخص بہت بڑا سخی اور فیاض طبع ہے۔ (دیکھو نووی حاشیہ مسلم) ایسا حضرت امام بخاری اور مشہور ومعروف صاحب فتح الباری بھی اس امر پر متفق ہیں کہ اس حدیث کے معنی ازواج مطہرات نے پہلے یہی سمجھے تھے۔ لیکن بعد میں اُن پر منکشف ہو گیا کہ اس کے معنے وہ نہیں جو انہوں نے سمجھے ہوئے تھے۔ بلکہ سخاوت اور فیاضی میں سبقت مراد تھی۔ (دیکھو بخاری باب صدقات)

اہل اسلام کی حق گوئی

غرض اسلامی لٹریچر میں دین کو ایسا مقدم رکھا گیا ہے کہ کسی شخص نے کسی کی کبھی کچھ رعایت نہیں کی۔ اور نہ ہی کسی امر کی پاس خاطر سے کبھی کسی امر کا اخفا کیا گیا۔ یا کسی امر کو کم وبیش کر کے لکھا گیا۔ یہاں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں نے ایک حدیث کے سمجھنے میں غلطی کھائی۔ تو اکثر معتبر کتابوں میں اسکا ذکر موجود ہے۔ یہ بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک پیشگوئی تھی۔ اگرچہ یہ پیشگوئی قرآن کریم کا کوئی حصہ نہ تھی لیکن آنحضرت صلعم کی فرمائی ہوئی تھی۔ اس لئے وہ اپنے صحیح منطوق کے ساتھ پوری ہوئی۔ یعنی ام المومنین زینب جو جود وسخا اور کرم وفیض میں سب بیویوں سے بڑھی ہوئی تھیں سب سے پہلے فوت ہوئیں اور سودا رضؓ پہلے فوت نہ ہوئیں۔ جن کے ہاتھ جسمانی طور پر لمبے تھے جب کہ ایسی معمولی درجہ کی باتوں کے اختلافات اور معانی احادیث میں اس قدر دیانت داری اور احتیاط کے ساتھ درج ہیں۔ تو قرآن کریم کی حفاظت کے وعدوں کی آیات جو ایک پہلو سے اصول اسلام میں شمار ہوتی ہیں۔ اور ایسی اہم اور ضروری ہیں۔ کہ ہر ایک کو اُن کے معانی کے ساتھ بڑا بھاری تعلق ہے۔ تو ایسے اہم امر کی متعلقہ آیات کے لفظی معنوں اور اس عظیم الشان وعدہ کے ظاہری رنگ میں پورا ہونے میں ذرا بھی اختلاف و انحراف واقعہ ہوتا تو نہایت ضروری تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کثیر اس طرف جاتی کہ اس پیشگوئی سے مراد اس کا ظاہری الفاظ میں پورا ہونا نہیں بلکہ اس سے کچھ اور مطلب ہے۔ اور وہ مطلب بیان کرتے اور آئندہ نسلوں کو اس سے مطلع کرتے لیکن حدیث کے اتنے بڑے ذخیرے میں کہیں کسی جگہ صحیح اور مستند تو کیا کوئی ضعیف سے ضعیف حدیث بھی اس بات کی تائید میں نہیں ملتی۔ جس میں صراحت نہ سہی اشارہ ہی ہو کہ یہ وعدہ الٰہی اپنے ظاہری معنوں میں پُورا نہ ہوا۔ اور اسکی تاویل یہ کی گئی تھی۔

عدم تحریف کا یقینی ثبوت

کسی حدیث میں اس بات کا صراحتًا یا کنایۃً ذکر نہ ہونا قرآن کریم کے محفوظ رہنے کی ایک ایسی زبردست دلیل ہے۔ کہ اس کے بعد کسی اور دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ اور اس سے قطعی اور یقینی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے اور اُن کی زندگیوں میں ایک حرف کی بھی تحریف یا تغیر وتبدل یا کمی زیادتی نہیں ہوئی۔ بلکہ صحابہ کرام کے بعد بھی ہم یہی بات دیکھتے ہیں چنانچہ وہ بزرگ قوم تابعین جنہوں نے بڑی محنتوں اور مشکلات سے محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور دین کی خاطر صحابہ سے قرآن شریف سیکھا تھا اور احادیث حاصل کی تھیں۔ اور اُن کی صحبت سے بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ اس امر پر متفق ہیں کہ ان آیات سے یہی مراد ہے کہ قرآن شریف میں کوئی تصرف اور آمیزش کبھی راہ نہ پائے گی۔ اور خدا اس کی نگہبانی کرتا رہے گا۔ اس تمام تحریر سے یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔ کہ آنحضرت صلعم کے اصحاب قرآن شریف کی حفاظت کی پیشگوئی مندرجہ قرآن کریم کا پورا ہونا ظاہری الفاظ کے موافق مانتے تھے۔ اور اس پر یقین کامل رکھتے تھے کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ اور یہ وعدہ الٰہی ہے۔ اگر کسی طرح سے وہ اس وعدہ

الٰہی میں تجاوز محسوس کرتے اور اس بات کو دیکھ پاتے کہ قرآن شریف میں کوئی تصرف اور تحریف کسی طرح سے واقع ہو گیا ہے۔ تو ایسے جوانمرد راستبازی کے عاشق سچائی کے حامی اور شیدائی کبھی خاموشی اختیار نہ کرتے لیکن ساری تواریخ کے اوراق دیکھ لو کہیں ایک حرف بھی ایسا نہ پاؤ گے کہ جس سے اشارتاً ہی اس کی تائید ہوتی ہو۔ کہیں یہ نہیں دیکھو گے کہ صحابہ کی جماعت بلکہ اُن کے کسی ایک فرد متنفس نے بھی اس وجہ پر آنحضرت صلعم کی صداقت پر حرف رکھا ہو۔ اسلامی تواریخ دوسرے مذاہب کی تاریخ کی طرح مخفی اور تاریک نہیں۔ بلکہ نہایت مکمل اور مفصل اور معتبر تاریخ موجود ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا سراسر غلط اور وہم ہو گا کہ وہ ہو گا کہ ایسا عظیم الشان اور اہم امر واقعہ ہوا ہو۔ اور چھوڑ دیا گیا ہو۔ یا وہ متاخرین کی نظروں سے ہی مخفی رہا ہو صحابہؓ کے حالات دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ایسے لوگ نہ تھے۔ کہ اس پیشگوئی کو بظاہر ناکام دیکھ لیتے اور خاموش بیٹھے رہتے وہ ایسے دلیر اور سچائی کیلئے شجاع تھے کہ اگر کہیں ذرہ سا شک بھی ان کی طبیعت میں کسی امر پر پیدا ہوتا۔ تو وہ بہت آزادی سے بیان کرتے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شبہ یا وسوسہ اُن کے دلوں میں کسی وقت راہگیر ہوتا تو وہ آنحضرت سرور کائنات صلعم کے حضور میں بھی بآزادی تمام پیش کر دیتے تھے۔ اور کبھی نہ رُکتے تھے۔

واقعہ حدیبیہ اور حضرت عمر کا اعتراض

ہم اُن کی اس جرات ایمانی کے متعلق بطور مثال ایک واقعہ کو پیش کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے رویا میں دیکھا کہ آپ صلعم مع جماعت طواف بیت اللہ کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ رویا منجانب اللہ تھا اس لئے چودہ سو سے کچھ زیادہ جماعت صحابہ لیکر آپ صلعم مدینہ سے مکہ معظمہ کی طرف بارادۂ حج روانہ ہو پڑے۔ لیکن جب آپؐ مع جماعت حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قریش مکہ اپنی جمعیت لیکر مقابلہ کیلئے آ گئے۔ اور مزاحم ہوئے۔ اور کہا کہ ہم اس سے آگے تمہیں بڑھنے نہیں دیں گے۔ بہت ساری قیل و قال کے بعد اس مقام پر فریقین کے درمیان صلح تجویز ہوئی۔ جس کا نام صلح حدیبیہ ہے۔ اس صلح کی رو سے نہ صرف آنحضرت صلعم کو وہیں سے مدینہ کی طرف واپس ہونا ہی پڑا۔ بلکہ اور بھی بعض ایسی باتیں منظور کرنی پڑیں۔ جو صحابہ کو ناگوار گذریں۔ یہ شرائط عام طور پر مسلمانوں پر شاق گذریں کیونکہ انہیں حج کرنے کے بغیر وہیں سے واپس جانا پڑا۔ اس پر حضرت عمر حضور رسالت مآب صلعم میں حاضر ہوئے۔ اور مسلمانوں کے خیالات کو بدیں الفاظ پیش کیا۔ فقال عمر بن الخطاب فاتیت نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت الست نبی اللہ حقا؟ قال بلیٰ! قلت السنا علی الحق وعدونا علی الباطل؟ قال بلیٰ! قلت فلم نعطی الدنیة فی دیننا اذاً۔ قال انی رسول اللہ ولست اعصیہ وھو ناصری قلت اولیس کنت تحدثنا انا سناتی البیت فنطوف بہ؟ قال بلیٰ افاخبرتک انا ناتیہ العام قال قلت لا قال

فانك آتيه ومطوف به یعنی حضرت عمرؓ بن الخطاب نے فرمایا۔ پس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ کیا آپ خدا کے برحق رسول نہیں؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں بیشک میں خدا کا رسول برحق ہوں۔ پھر میں نے عرض کیا کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں بیشک! پھر میں نے عرض کیا تو پھر کیا وجہ ہے کہ ایسی مضر شرائط قبول کریں جو ہمارے دین کو نقصان پہنچانے والی ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ میں خدا کا رسول ہوں اور میں اس کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتا اور وہی میرا مددگار ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ نے یہ نہ فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ میں پہنچیں گے۔ اور طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں! لیکن کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم اسی سال وہاں پہنچیں گے؟ پھر میں نے جواب دیا نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ بیشک تم بیت اللہ میں پہنچو گے۔ اور طواف کرو گے (بخاری کتاب الشروط) اب جائے غور ہے کہ جو جرأت اور استقلال اور ہمت خدا تعالیٰ نے حضرت عمر بن الخطاب کو عطا کی ہوئی تھی اس سے دنیا میں کوئی شخص بے خبر نہیں ہو سکتا۔ اور جس طرح وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی خادم تھے وہ بھی تمام جہان کو معلوم ہے۔ ایسا جلیل القدر انسان اپنے آقا اور مخدوم کی خدمت میں صرف اتنی بات پر اتنی بڑی جرات سے بھرے ہوئے سوال کرتا ہے اور وہ بات ہی کیا تھی۔ صرف یہی کہ آنحضرت صلعم نے کفار مکہ کے روکنے سے حج کے ارادہ کو سال آئندہ پر ملتوی کر دیا تھا۔ اور صلح کی شرائط منظور کر کے حدیبیہ ہی سے مدینہ کی طرف مراجعت کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ جب ہم حضرت عمر کا ایمان آنحضرت صلعم پر دیکھتے ہیں۔ اور اُن کی اس بات پر غور کرتے ہیں۔ کہ وہ سچے دل سے آپ کو خدا کی طرف سے سمجھتے تھے اور یہ بھی جانتے اور مانتے تھے کہ وہ جو کام کرتے ہیں خدا ہی کے حکم سے کرتے ہیں۔ پھر ایسے ایمان کے باوجود ایسے سوالات سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ وہ لوگ حق کے لئے ایسے بہادر تھے کہ ذرا سی بات کو بھی یوں ہی نہ چھوڑتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس وقت تک صبر نہ کیا جب تک کہ اُن کی خاطر خواہ تسلی نہ ہو گئی۔ اور امر حق اُن کو نہ معلوم ہو گیا۔ کہ حضور سرور کائنات صلعم کا رویا بالکل صحیح اور حق تھا۔ لیکن اس میں یہ شرط نہ تھی کہ حج اسی سال میں ہو گا۔ بلکہ اس میں صرف حج کا وعدہ دیا گیا تھا جس کا وقت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم تھا۔ اور محض حدیبیہ سے لوٹ جانے اور اس سال میں حج کرنے سے قاصر رہنے سے یہ نہیں قرار دیا جا سکتا کہ وہ رؤیا غلط تھا۔ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو یہ ایک ہی حدیث اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو جب کبھی کسی امر میں شبہ یا وسوسہ پیدا ہوتا تو اُن کی عادت تھی کہ نہایت آزادی کے ساتھ اس کو حضرت رسالت مآب صلعم کے حضور میں پیش کر دیتے۔ اور جب تک تسلی نہ ہوتی خاموش نہ ہوتے۔ اس لئے یہ یقینی بات ہے کہ اگر قرآن شریف میں ذرا تحریف یا تغیر

وتبدل واقع ہوتا تو اس پیشگوئی کی صداقت پر بہت زبردست اعتراض اُن کی طرف سے وارد ہوتے۔ اور یہ ضروری تھا کہ ایسے اعتراضات آیندہ نسلوں میں بھی مشتہر اور معروف ہوتے۔ لیکن تمام اسلامی کتب میں کہیں کوئی ایسی روایت موجود نہیں۔ اس سے صاف طور پر پایا جاتا ہے کہ کبھی کوئی وسوسہ قرآن کریم کی تحریف کی بابت پیدا ہی نہیں ہوا۔ اور اس سے یہ بات صریح طور سے ثابت ہوتی ہے کہ قرآن شریف ہر قسم کے تصرفات وتحریفات وتغیرات سے پاک رہا ہے۔ اور جس طرح آنحضرت صلعم سے صحابہ نے سیکھا تھا۔ اسی طرح بلا کم وکاست آج تک موجود ہے جس سے اس پیشگوئی کا منجانب اللہ ہونا اور اس کی صداقت ثابت ہے۔

رفع قرآن کا مطلب

مصنف تاویل القرآن نے محض بے سمجھی سے ابن ماجہ کی ایک حدیث نقل کی ہے۔ جس کا مطلب اس نے یہ لکھا ہے۔ کہ قرآن شریف پر ایک ایسا زمانہ آئیگا۔ کہ جب یہ سب کا سب اٹھا لیا جائیگا۔ یہاں تک کہ ایک آیت بھی باقی نہ چھوڑی جائیگی۔ اور پھر اس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جب کہ یہ جائز ہے کہ سارا قرآن شریف دنیا سے اٹھ جائے اور ایک آیت بھی اس کی روئے زمین پر باقی نہ رہے تو پھر بھی وعدہ انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون میں کچھ فرق نہیں آسکتا۔ تو پھر اگر قرآن شریف کا کوئی حصہ گم ہو جائے یا اس میں کوئی تصرف اور تحریف کر لی جائے تو اس وعدہ حفاظت میں کیونکر فرق آنا جائز تسلیم ہو سکتا ہے۔ معترض کو یہاں سخت ٹھوکر لگی ہے۔ قرآن شریف کے اٹھائے جانے سے یہ مراد نہیں کہ اس کی عبارت اور الفاظ کسی زمانہ میں دنیا سے اٹھا لئے جائیں گے۔ یہ تو یہاں لغو تعبیر ہے۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے۔ کہ مغز قرآن جہان سے اٹھ جائے گا۔ یعنی ایک زمانہ ایسا آئے گا۔ کہ جب لوگوں کی زبان پر قرآن ہوگا مگر اُن کی عملی زندگیوں سے وہ خارج ہوگا۔ بخاری اور مسلم میں جو احادیث صحیحہ اس مضمون پر آئی ہیں۔ اُن سے صاف پایا جاتا ہے۔ کہ علم قرآن علما کے نہ ہونے کی وجہ سے قبض کر لیا جائیگا۔ نہ کہ اس کے الفاظ قبض کرلئے جانے کی وجہ سے۔ چنانچہ بخاری کتاب العلم میں یہ حدیث آئی ہے عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعه من العباد ولکن یقبض العلماء یعنی عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہا فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ علم کو لوگوں میں سے چھین کر نہیں لے جائے گا۔ بلکہ علماء کے قبض کرنے سے علم قبض کرے گا۔ ایسا ہی بیہقی نے ایک حدیث روایت کی ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئیگا جب اسلام سے کچھ نہ رہے گا مگر صرف اس کا نام، اور قرآن سے کچھ نہ رہیگا مگر اس کے الفاظ چنانچہ مشکوٰۃ کتاب العلم میں یہ حدیث آئی ہے عن علی قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یوشك ان یاتی علی الناس زمان لا یبقی من الاسلام الا اسمه ولا یبقی من القرآن الا رسمه مساجدهم عامرة وهی خراب من الهدی علماؤهم شر من تحت ادیم السماء من عندهم تخرج الفتنة وفیهم تعود یعنی حضرت علی سے روایت ہے کہ کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا۔ کہ جب اسلام میں سے کچھ نہ رہے گا۔ مگر اس کا نام۔ اور قرآن میں سے کچھ نہ رہے گا مگر اس کے الفاظ۔ اُن کی مسجدیں معمور ہونگی۔ لیکن ہدایت کے نہ ہونے کے سبب سے حقیقت میں ویران ہونگی۔ اور اُن کے علماء بگڑ کر ایسے خراب ہو گئے ہونگے کہ پردۂ آسمان کے نیچے اُن سے بڑھ کر کوئی بُرا نہ ہوگا۔ اُن سے ہی فتنہ نکلے گا۔ اور انہیں میں عود کر کے داخل ہوگا۔

اب صاف ظاہر ہے کہ قرآن اٹھایا جانے سے یہ مراد نہیں کہ جس قدر قرآن لوگوں کے گھروں میں لکھے اور چھپے پڑے ہیں۔ یا جس قدر قرآن کتب خانوں اور دکانوں اور مسجدوں اور مقدس مقامات میں موجود ہیں۔ اور وہ لاکھوں نہیں کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ وہ سب کے سب کسی روز دنیا سے اٹھا لئے جائیں گے۔ اور جن لوگوں نے بڑی محنتوں سے اس کو کلاً یا جزاً حفظ کیا ہوا ہے۔ اُن کے حافظوں سے بھی اس کو سلب کر دیا جائیگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلامی عبادات بھی دنیا سے معدوم ہو جائیں گی۔ اور اس وجہ سے اسلام ہی دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ ایسا کبھی ممکن نہیں اور نہ ہی حدیث ابن ماجہ کا یہ منشاء ہے۔ مشکوٰۃ کتاب العلم میں ایک اور حدیث ہے۔ عن زیاد بن لبید قال ذکر النبی صلی اللہ علیه وسلم شیئاً فقال ذاك عند اوان ذهاب العلم۔ قلت یا رسول اللہ کیف یذهب العلم ونحن نقرءُ القرآن ونقرئه ابناءنا ویقرئه ابناءنا ابناءهم الی یوم القیامة فقال ثکلتك امك زیاد ان کنت لاراك من افقه رجل بالمدینة اولیس هذه الیهود والنصاری یقرءون التورات والانجیل لا یعلمون شیئاً مما فیهما یعنی زیاد بن لبید سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ کسی امر کے واقع ہونے کے متعلق فرمایا۔ کہ وہ علم کے گم ہو جانے کے زمانہ میں واقع ہوگا میں نے اس پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ علم مفقود ہو جائے گا جب کہ ہم قرآن پڑھتے ہیں اور اپنے بیٹوں کو پڑھاتے ہیں۔ اور ہماری اولاد اپنی اولاد کو پڑھائے گی۔ اور یہ سلسلہ روز قیامت تک چلا جائیگا۔ یہ بات سن کر آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ "اے زیاد تیری ماں تجھ سے محروم ہو جائے!! میں تو سمجھتا تھا کہ مدینہ میں تو ایک بڑا دانا آدمی ہے۔ کیا یہ یہود اور نصاریٰ توریت و انجیل کو نہیں پڑھتے لیکن وہ ان کی کسی بات پر عمل نہیں کرتے۔" اب اس حدیث

سے ہمارے مقصود پر اور بھی زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ کہ جب آنحضرت صلعم نے بیان فرمایا کہ کسی زمانہ میں علم گم ہو جائیگا۔ تو معاً ایک صحابی نے خیال کر کے کہ علم کے معنی صرف پڑھنے پڑھانے کے ہیں عرض کیا کہ جب کہ ہم خود قرآن کریم پڑھتے ہیں۔ اور اپنی اولاد کو پڑھاتے ہیں۔ اور ہماری اولاد میں یہ سلسلہ تعلیم و تعلم قرآن شریف تا قیامت جاری رہے گا۔ تو پھر علم گم کیونکر ہو جائیگا۔ اس کی تشریح خود بخود آنحضور صلعم نے یہود اور نصاریٰ کی مثال پیش کر کے فرما دی یعنی علم سے مراد یہ نہیں کہ کتاب الٰہی کو طوطے کی طرح پڑھتے رہیں بلکہ مراد اس سے یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور علم گم ہونے سے یہی مطلب ہے کہ گویا لوگوں میں سے عمل اٹھ جائیگا۔ نہ کہ اُسکے الفاظ اور عبارات۔ اس جگہ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حفاظت توریت کا حکم انسانوں کو دیا گیا تھا۔ مگر حفاظت قرآن کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا۔ کیونکہ جو حکم انسانوں کو دیا جاتا ہے ضرور ہے کہ اس میں انسان تجاوز بھی کریں۔ جس طرح احکام شریعت میں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ توریت میں تحریف ہوئی۔ مگر قرآن شریف میں نہیں ہوئی۔

(۲) وہ دلائل جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کل قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور آپ کی ہدایت کے مطابق لکھا گیا تھا

قرآن کریم کی آخری آنحضرت صلعم کے سامنے لکھی گئی

اس جگہ ہم وہ ظاہری اسباب بیان کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ نے اپنے اس وعدہ کو پورا کرنے کے لئے پیدا کر دیئے تھے کہ قرآن کریم محفوظ رہے گا۔ سب سے پہلے اور نہایت ضروری بات یہ تھی کہ جس شخص پر یہ کلام الٰہی نازل ہوتا تھا اس کے سامنے ہی ضبط تحریر میں آجائے تا بعد میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہ ہو۔ چنانچہ جب کوئی حصہ قرآن شریف کا نازل ہوتا تھا اسی وقت اس کو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم لکھوا دیتے اور مشتہر کرا دیتے اور اکثر صحابیوں کو حفظ کرا دیتے۔ یہاں تک کہ اس انتظام کے ساتھ سارے کا سارا قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا۔ قبل اس کے کہ ہم قرآن و حدیث سے اس امر پر شہادت پیش کریں۔ ہم سر ولیم میور کی لائف آف محمد کے دیباچہ کے صفحہ ۲۸ سے ذیل کی عبارت کا اقتباس کرتے ہیں۔ جس میں عیسائی مصنف نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ

میور کی شہادت

قرآن شریف حضور رسالت پناہ محمد مصطفےٰ صلعم کی آنکھوں کے سامنے لکھا جا چکا تھا۔ وہ لکھتا ہے "لیکن اس بات کو ماننے کے لئے بہت زبردست وجوہ موجود ہیں۔ کہ (حضرت) رسول (کریم صلعم) کی زندگی میں متفرق طور پر قرآن شریف کے نسخے لکھے ہوئے صحابہ کے پاس موجود تھے اور ان نسخوں میں سارا قرآن

یا قریباً سارا لکھا ہوا موجود تھا۔ اس میں شک نہیں کہ (حضرت) محمد (مصطفےٰ صلعم) کے دعوے نبوت سے بہت پہلے مکہ میں فن تحریر مروج تھا۔ اور مدینہ میں جاکر تو خود پیغمبر خدا صلعم نے اپنے مراسلات لکھوانے کے لئے کئی صحابی مقرر کئے ہوئے تھے۔ جو لوگ بدر میں گرفتار ہو کر آئے تھے انہیں اس شرط پر وعدہ رہائی دیا گیا تھا کہ وہ بعض مدنی آدمیوں کو لکھنا سکھلا دیں۔ اور اگرچہ اہل مدینہ اہل مکہ کے برابر تعلیم یافتہ نہ تھے۔ لیکن وہاں بھی بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو اسلام سے پہلے لکھنا جانتے تھے"۔

قرآن لکھا جانے پر اندرونی شہادت

خود قرآن شریف میں بھی بہت صفائی سے اس امر کی شہادت موجود ہے کہ یہ اس وقت لکھا ہوا موجود تھا۔ پہلے تو لفظ کتاب ہی قابل غور ہے جو بار بار مختلف سورتوں میں قرآن کریم کی نسبت آیا ہے اور کتاب کے معنی لکھے ہوئے کے ہیں۔ ایسا ہی قرآن شریف کو **صحف** بھی کہا گیا ہے۔ اور صحیفہ کے معنی لکھے ہوئے کاغذ کے ہیں۔ چنانچہ سورۃ البینہ میں ہے رسول من اللہ یتلوا صحفاً مطھرۃ فیہا کتب قیمۃ یعنی اللہ کا رسول مقدس اوراق پڑھ کر سناتا ہے جن میں مضبوط کتابیں موجود ہیں۔ اب یہ اوراق مقدس قرآن شریف کے اوراق ہیں۔ اور کتب قیمہ اس کی سورتیں ہیں۔ کیونکہ نہ صرف کامل قرآن شریف ہی کو الکتاب کہا گیا ہے۔ بلکہ اس کی ہر ایک سورۃ کو بھی کتاب کا نام دیا گیا ہے۔ ایسا ہی سورہ عبس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کلا انہا تذکرۃ فمن شاء ذکرہ۔ فی صحف مکرمۃ مرفوعۃ مطھرۃ۔ بایدی سفرۃ۔ کرام بررۃ۔ ترجمہ قرآن تو (سراسر) نصیحت ہے۔ پس جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔ اور (وہ قرآن) اوراق میں (لکھا) ہے۔ جن کی تعظیم کی جاتی ہے (اور وہ) اونچی جگہ رکھے ہوئے (ہیں اور) پاک ہیں (اور ایسے) لکھنے والوں کے ہاتھوں میں (رہتے ہیں) جو بزرگ (اور) نیکوکار ہیں"

لفظ **صحف** جو یہاں استعمال ہوا ہے وہ صحیفہ کی جمع ہے۔ اور یہ وہی لفظ ہے جو ان تمام مجموعوں کے لئے بولا جاتا ہے جو حضرت زید بن ثابت نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جمع کئے تھے۔ پس یہ امر نہایت صفائی سے ثابت ہے۔ کہ خود قرآن کریم نے اپنے لئے لفظ کتاب اور صحیفہ استعمال کئے ہیں۔ اور ان دونوں لفظوں کے عربی زبان میں "لکھی ہوئی کتاب" معنی ہیں۔ جو ہر ایک لغت عرب سے ثابت ہے اور آج تک عام طور پر لفظ مُصحف کا قرآن کریم کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور وہ بھی صحیفہ سے ماخوذ ہے۔ اور اس کے معنی ایک کتاب ہیں جس میں بہت سے صحیفے جمع ہوں یعنی لکھے ہوئے اوراق ہوں +

کوئی حصہ قرآن کا ایسا نہیں جو لکھا نہ گیا ہو

قرآن شریف کے دیگر مقامات سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اس کی سورتیں ابتدائی زمانہ میں ہی لکھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ سورۂ الواقعہ میں جو ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی نسبت فرماتا ہے۔ انہ لقراٰن کریم فی کتاب مکنون لا یمسہ الا المطھرون یعنی یہ (قرآن) بڑی قدر و منزلت

کا قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں لکھا ہوا۔ اُسے چھوتے نہیں مگر جو پاک ہیں۔ ان آیات سے دو باتیں پایہ ثبوت کو پہنچتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن ایک محفوظ کتاب ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ جسے کوئی محرف ومبدل نہیں کر سکتا۔ دوسرا یہ کہ قرآن کریم اسی ابتدائی زمانہ میں لکھا جا چکا تھا۔ کیونکہ ناپاکوں کو اسے چھونے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ ایک بڑی موٹی بات ہے کہ مس کرنے کے لئے کسی شے کا وجود جسمانی رنگ میں ہونا ضروری ہے۔ الفاظ کا مس نہیں ہو سکتا۔ اگر وہی الفاظ ضبط تحریر میں آکر کتاب کی صورت بن جائیں تو وہ ایک جسم بن جاتا ہے۔ اور چھوا جا سکتا ہے۔ اس سے صاف ثابت ہے کہ قرآن کریم اسی ابتدائی زمانہ میں لکھا جا چکا تھا۔ اور کتاب کی صورت میں تھا۔ اگر یہ لکھا ہوا نہ ہوتا تو اس پر لفظ مس کا اطلاق ہی نہ ہوتا راڈول ایک یورپین ہے جس نے قرآن شریف کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس نے اپنے انگریزی ترجمہ میں اس موقعہ پر مفصلہ ذیل حاشیہ دیا ہے۔ "اس جملہ سے کم از کم اتنا تو پتہ ملتا ہے۔ کہ قرآن شریف کی سورتوں کے لکھے ہوئے نسخے اس وقت عام طور پر زیر استعمال تھے۔ حضرت عمر کی ہمشیرہ فرماتی ہیں کہ جب وہ مسلمان ہونے لگے تو انہوں نے مجھے کہا کہ سورۃ طٰہٰ کا نسخہ میرے ہاتھ میں دیدو۔ آیات ۷۷۔۷۸ جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ وہ بحکم خلیفہ محمد ابو القاسم بن عبد اللہ قرآن کریم کی تمام جلدوں پر لکھی جانی شروع ہوئیں۔" (دیکھو ترجمہ قرآن راڈول صفحہ ۵۴) یہ بات صحیح نہیں کہ اس جملہ سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ قرآن شریف کے صرف بعض حصے ہی لکھے گئے تھے۔ اس عبارت سے کسی طرح یہ نہیں پایا جاتا کہ کوئی حصہ قرآن شریف کا ایسا بھی رہ گیا تھا کہ جو لکھا ہی نہ گیا ہو۔ اس میں صاف لکھا ہے کہ سارا قرآن لکھی ہوئی کتاب ہے۔ نہ کہ بعض حصے اس کے لکھنے سے رہ گئے یا چھوڑے گئے تھے۔ پس ان آیات میں یہ شہادت صریح طور پر موجود ہے کہ سارا قرآن شریف لکھا ہوا تھا۔ اور اگر کوئی شخص اسکے برخلاف یہ کہے کہ بعض حصے لکھے ہوئے تھے اور بعض نہیں تو اس کا فرض ہے کہ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے اس کے مخالف شہادت پیش کرے۔ لیکن ایسی شہادت نہ قرآن شریف سے ملتی ہے نہ حدیث سے پائی جاتی ہے۔ نہ ساری اسلامی تاریخ میں کہیں ایسا واقعہ نظر آتا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ قرآن شریف کی بعض سورتوں کو بعض سے متفاوت اور مختلف سمجھا گیا ہو۔ یا یہ خیال کیا جا سکے کہ بعض سورتیں لکھی گئی تھیں۔ اور بعض کو اس لایق نہیں سمجھا گیا تھا۔ کہ وہ لکھی جاتیں۔ یا یہ کہ ساری سورتوں کی مساوی احتیاط نہیں کی گئی۔ یا یہ کہ قرآن شریف کے ہر ایک لفظ کی حفاظت کیلئے مساوی خواہش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اور بزرگان دین نے نہ کی تھی۔ بعض کی کی اور بعض کی نہ کی یا کچھ کم کی۔

کفار کی تحدی میں قرآن کے لکھے جانے کی شہادت

ایک اور دلیل جو قرآن شریف کے لکھا ہوا ہونے پر خود قرآن کریم سے ہی ملتی ہے یہ ہے کہ کفار مکہ

کہتے تھے کہ یہ قرآن گویا (نعوذ باللہ منہا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ ہی بنا لیا ہوا ہے۔ خدا کی طرف سے وحی نہیں۔ ایسے لوگوں کو چیلنج کیا گیا تھا۔ امر یقولون افترٰیہ۔ قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریات وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین۔ یعنی (اے پیغمبر) کیا کافر کہتے ہیں کہ اس شخص یعنی تم نے قرآن کو اپنے دل سے بنا لیا ہے۔ تو (ان لوگوں سے) کہو کہ اگر تم سچے ہو تو تم بھی (اہل زبان ہو) اسی طرح کی بنائی ہوئی (زیادہ نہیں) دس (ہی) سورتیں لے آؤ اور خدا کے سوا جس کو (مدد کے لئے) تم سے بلاتے بن پڑے بلا لو" یہ آیتیں سورہ ہود میں ہیں۔ اور سورہ ہود مکہ میں اس وقت نازل ہوئی۔ جب کہ ابھی ہجرت بھی نہ ہوئی تھی۔ ایسے ہی سورہ بنی اسرائیل جو اس سے بھی پہلے کی نازل شدہ ہے۔ اس کی ۹۱ آیت میں یہ چیلنج درج ہے قل لئن اجتمعت الانس و الجن علٰی ان یاتوا بمثل ھٰذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔ یعنی (اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہو کہ اگر آدمی اور جن جمع ہو کر (اس بات پر آمادہ) ہوں کہ اس قرآن کی طرح کا (اور کلام) بنا لائیں تو وہ کبھی اس جیسا نہیں بنا لا سکتے۔ اگرچہ اُن میں سے ایک کی پشتی پر ایک (کیوں نہ) ہو" پھر سورہ البقرہ کی آیات ۲۱-۲۲ میں یہ تحدی درج ہے وان کنتم فی ریب مما نزلنا علٰی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین ۝ فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ اعدت للکٰفرین۔ یعنی اور وہ جو ہمنے اپنے بندے (محمد) پر (قرآن) اتارا ہے۔ اگر تم کو اس میں شک ہو۔ (اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب خدا کی نہیں۔ بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے) اور (اپنے اس دعوے میں) سچے ہو۔ تو اس جیسی ایک ہی سورہ (تم بھی بنا) لاؤ۔ اور اللہ کے سوا جو (تمہاری حمایت کو) آموجود ہوں۔ اُن کو بھی بلا لو پس اگر (اتنی بات بھی) نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو (دوزخ کی) آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہونگے جو منکروں کے لئے تیار ہے"۔ یہ آیت مدنی ہے۔ اب ان مکی اور مدنی سورتوں میں کہیں یہ چیلنج ہے۔ کہ اس قرآن جیسا قرآن بنا لاؤ، کہیں یہ کہ اس جیسی دس سورتیں بنا لاؤ اور کہیں یہ کہ ایک ہی سورہ اس کے مقابلہ میں بنا لاؤ۔ قرآن شریف کی سورتیں لکھی ہوئی موجود نہ ہوتیں تو ایسا چیلنج بے معنی ہوتا کیونکہ ضروری ہے کہ جس چیز کا مقابلہ کرنے کے لئے کسی کو تحدی کی جائے تو وہ چیز بھی اُس کے سامنے رکھی جائے۔ والا وہ مقابلہ ہی کیا کر سکتا ہے اور ایسی صورت میں کفار کیطرف سے یہی جواب دیا جاتا کہ پہلے ہمیں وہ سورتیں دکھاؤ جن کا مقابلہ چاہتے ہو۔

قرآن شریف کی شہادت کے علاوہ اعلیٰ طبقہ کی صحیح احادیث میں بہت سارے واقعات ایسے درج

احادیث کی شہادت کہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت اپنے اپنے موقع پر رکھی گئی

ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی ہوتی تو وہ اسی وقت لکھ لیجاتی ذیل کی روایت میں حضرت عثمان نے قرآن شریف کی آیات کے لکھا جانے کا طریق بیان کیا ہے۔

عن عثمان بن عفان قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مما یاتی علیہ الزمان یتنزل علیہ من السور ذوات العدد فکان اذا نزل علیہ الشی یدعوا بعض من یکتب عندہ فیقول ضعوا ھذا فی السورۃ التی یذکر فیھا کذا یعنی آنحضرت صلعم کا دستور تھا کہ ایسے اوقات میں چند سورتیں ایک ہی وقت میں نازل ہوتی تھیں۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو اُن لوگوں میں سے جو قرآن شریف لکھا کرتے تھے کسی ایک کو بلا بھیجتے۔ اور فرماتے کہ اسے فلاں سورت میں اس موقعہ پر جہاں ایسا ایسا ذکر ہے رکھدو۔ پس یہ امر نہایت صفائی سے ثابت ہے کہ ہر ایک سورہ قرآن شریف کی اور ہر ایک آیت قرآن شریف کی آنحضرت صلعم کے حکم و ہدایت سے آپ کے سامنے اسی وقت لکھ لی جاتی جب کہ وہ نازل ہوتی۔ اور مزید احتیاط آپ یہ فرماتے کہ جب کبھی دو یا دو سے زیادہ سورتیں ابھی غیر مکمل ہوتیں۔ تو جس مقام اور سورت اور موقعہ پر وہ آیت لکھنی چاہئے تھی اسی جگہ لکھنے کی ہدایت فرماتے تاکہ کاتب ایک سورۃ کی آیات کو کسی دوسری سورۃ کی آیات سے مخلوط نہ کر سکیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اس امر پر اکیلی ہی نہیں۔ بلکہ اور بھی بہت ساری روایات صحیح احادیث میں ایسی موجود ہیں جو اس گواہی کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً بخاری باب کاتب النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں براکی روایت سے یہ حدیث ہے قال لما نزلت لا یستوی القاعدون من المومنین والمجاھدون فی سبیل اللہ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ادع لی زید او لیجئی باللوح والدواۃ والکتف او الکتف والدواۃ ثم قال اکتب لا یستوی القاعدون یعنی جب آیت لا یستوی القاعدون من المومنین والمجاھدون فی سبیل اللہ (سورۃ النسا آیت ۹۵) نازل ہوئی تو حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زید کو میرے پاس بلا لاؤ۔ اور کہو کہ دوات اور لوح ساتھ لاوے۔ پھر جب وہ آپہنچا تو اسے حکم دیا کہ لا یستوی الخ ساری آیت لکھو۔ ایسے ہی بخاری کے اسی باب میں ایک اور حدیث آئی ہے جس میں لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زید کو مخاطب کرکے فرمایا کہ انک کنت تکتب الوحی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی بیشک تو آنحضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی لکھا کرتا تھا۔ اس مکرم عہدہ کتابت وحی پر حضرت زید تو مامور ہی تھے۔ اور اس ماموریت کی وجہ سے کثیر حصہ مدنی وحی کا انہوں نے ہی لکھا تھا لیکن اُنکے سوا اور بھی وحی نبوت لکھنے والے اصحاب موجود تھے جنہوں نے مکی سورتیں مکہ میں لکھیں۔

کاتبان وحی

اور بعض مدنی آیات کو جب کبھی حضرت زید موجود نہ ہوتے تو اُن کی غیر حاضری میں اوروں نے لکھا۔ ان معظم اور مقدس بزرگوں کے اسماء کی فہرست میں حضرت ابو بکر صدیق۔ حضرت عثمان حضرت عمر۔ حضرت علی۔ عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح (جو ایک وقت میں مرتد بھی ہو گیا تھا اور فتح مکہ کے بعد پھر مسلمان ہوا تھا) حضرت زبیر بن عوام۔ حضرت خالد و ابان ابنائے سعید۔ ابی بن کعب۔ حنظلہ بن الربیع۔ معیقب بن ابو فاطمہ۔ عبد اللہ بن ارقم۔ شرحبیل بن حسنہ۔ عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ دیکھو فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۹ باب کاتب وحی رسول اللہ۔ کاتبانِ وحی میں بعض مورخین نے بیالیس صحابہ کے نام لکھے ہیں۔

احادیث کے تحریر میں لانے کی ممانعت

ان کے ماسوا بہت سارے ایسے واقعات موجود ہیں جو دوسرے طور پر اس ثبوت کو اور بھی مضبوط کرتے ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ آنحضرت صلعم نے اپنے اصحاب سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ لا تکتبوا عنی شیئاً غیر القرآن یعنی مجھ سے سوائے قرآن کے کوئی شے مت لکھو۔ یہ ہدایت اس غرض سے احتیاطاً حفظ ماتقدم کے طور پر دی گئی تھی۔ کہ قرآن شریف کے ساتھ حضور سرور کائنات صلعم کی اپنی باتیں کہیں لوگ نہ ملادیں۔ اور یہ بھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف کے لکھا جانے کا حکم دیا تھا۔ اور وہ لکھا بھی جاتا تھا غیر قرآن لکھنے کی ممانعت قرآن کے لکھا جانے میں صریح شہادت ہے۔ بخاری کتاب العلم کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ احتیاط کو ملحوظ رکھ کر احادیث کو لکھنے کی بھی اجازت دی گئی تھی۔

حضرت عمر کے اسلام لانے کے واقعہ میں قرآن کے لکھا جانے کی شہادت

پھر جب حضرت عمر نے اسلام قبول کیا۔ تو اس وقت کی سرگذشت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف اس زمانہ میں ہی لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ ابن ہشام میں لکھا ہے کہ حضرت عمر نے جب دیکھا کہ آنحضرت صلعم شرک اور بت پرستی کے مذہب کی بیخ اکھاڑنے کے درپے ہیں۔ تو اس جوش میں آکر یہ ارادہ کیا کہ میں آنحضرت کو ہی جان سے مار دوں گا۔ ایک دن یہ بات دل میں ٹھان کر گھر سے ہی تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے آنحضرت کی طرف روانہ ہوئے کہ جہاں کہیں آپ ملینگے وہیں قتل کر دوں گا۔ راستے میں جاتے ہوئے اُن کو یہ خبر ملی کہ اُن کی اپنی ہمشیرہ فاطمہ اور اس کا خاوند سعید بن زید مسلمان ہو گئے ہیں۔ یہ بات سن کر وہ اور بھی غصہ میں بھڑکے اور وہیں سے سیدھے اپنی بہن کے گھر پہنچے۔ کہ تا پہلے اُن کا کام ہی تمام کیا جائے۔ اس وقت اُنکے گھر میں ایک تیسرا آدمی بھی موجود تھا جس کا نام خباب تھا اور جس کو حضرت عمر جانتے تھے کہ وہ مسلمان ہے۔ خباب کے پاس اس وقت ایک جلد موجود تھی جس میں سورہ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ اور وہ اس وقت حضرت عمر کی ہمشیرہ اور اس کے خاوند کو سورہ طٰہٰ

پڑھا رہا تھا۔ جب اُن کو یہ معلوم ہؤا کہ حضرت عمرؓ آرہے ہیں تو فوراً خبابؓ تو ایک گوشہ میں جا چھپے اور فاطمہ ہمشیرہ حضرت عمرؓ نے وہ جلد اٹھا کر اپنے پاس چھپالی۔ لیکن اُن کا چھپنا بالکل بے سود تھا۔ کیونکہ حضرت عمرؓ اُن کے نزدیک ایسے مقام پر پہنچ گئے ہوئے تھے کہ انھوں نے خبابؓ کا پڑھانا اور اُن کا پڑھنا سُن لیا تھا۔ پس جب آپ کمرہ کے اندر داخل ہوئے تو اندر قدم رکھنے کے ساتھ ہی پہلا سوال یہ کیا کہ تم کیا پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے کچھ نہیں سنا ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا نہیں میں نے سُنا ہے۔ اور مجھے یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ تم نے محمد (صلے اللہ علیہ و سلم) کا دین قبول کر لیا ہے۔ یہ بات کہتے ہی انھوں نے اپنے بہنوئی کو پکڑ لیا۔ کہ اس کا کام تمام کریں۔ یہ ماجرا دیکھتے ہی اُن کی ہمشیرہ اپنے خاوند کو چھڑانے کیلئے لپٹ گئی۔ اس ہنگامہ میں فاطمہ کو سخت زخم لگا۔ حضرت سعید اور فاطمہ دونوں میاں بیوی نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اب تمہاری مرضی ہے جو چاہو ہم سے سلوک کرو۔ جب حضرت عمر نے اپنی ہمشیرہ کا خون بہتے دیکھا تو اپنی اس حرکت پر بہت پشیمان ہوئے۔ اور انہیں کہا کہ جو کتاب تم پڑھ رہے تھے وہ لاؤ اور مجھے بھی دکھاؤ کہ میں بھی دیکھوں تو سہی کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے کیا لا کر دیا ہے حضرت عمر خود لکھے پڑھے تھے۔ جب انہوں نے باصرار طلب کیا تو اُن کی ہمشیرہ ڈریں کہ مبادا کہیں لیکر وہ اس کتاب کو ضائع ہی نہ کر دیں۔ اس لئے حضرت عمر سے عہد لے لیا۔ اور انہوں نے اپنے بتوں کی قسم کھائی کہ میں یہ کتاب ضایع نہیں کروں گا۔ بلکہ دیکھ کر واپس کر دوں گا۔ پھر اس نے کہا کہ تم مشرک نجس ہو اس لئے اس کو چھونے کے لئے طہارت کی ضرورت ہے۔ اس پر حضرت عمر نے غسل کیا۔ اور پھر اُن کی ہمشیرہ نے وہ جلد اُن کے ہاتھ میں دیدی۔ جس میں سورہ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ حضرت عمر نے اس میں سے کچھ حصہ پڑھا۔ اور بہت تعجب کیا کہ یہ ایسی عجیب کتاب ہے اور بہت ہی عزت کی۔ پھر خبابؓ نے اُن کا میلان دیکھکر کہا کہ آپ اسلام قبول کر لیں۔ یہ ایک لمبی واردات ہے۔ ہم اس کو اسی جگہ تک لکھ کر چھوڑتے ہیں۔ اس سے صاف ثابت ہے کہ اس ابتدائی زمانہ میں ہی مسلمانوں میں عام طور پر لکھے ہوئے قرآن شریف مستعمل تھے۔ اور حضرت عمر کی ہمشیرہ کا اُن کو یہ کہنا کہ نجس ہونے کی حالت میں کوئی شخص قرآن شریف کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ یہ بھی اس بات پر شہادت ہے کہ لکھے ہوئے نسخے قرآن کریم کے اس کثرت سے استعمال میں تھے۔ ایک نئے مسلمان شدہ شخص کو بھی یہ پتہ تھا کہ نجاست کی حالت میں قرآن شریف کو مس کرنا منع ہے۔

اسی طرح اس حدیث سے کہ نہینا ان نسافر بالقرآن الی ارض العدو جو صحیح بخاری میں ہے

ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم لکھا جاتا تھا۔ اور اس کے دشمن کی سرزمین میں لے جانے کی ممانعت تھی۔ کہ تا دشمن کتاب اللہ کو ضایع نہ کریں۔ یا اس کی بے حرمتی نہ کریں۔ ان روایات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن شریف کے لکھے ہوئے نسخے خاص خاص آدمیوں تک محدود نہ تھے اور عام طور پر پائے جاتے تھے۔ اور تاریخ اس امر پر گواہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے صحابہ میں سے بہت لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے یہاں تک کہ عورتیں بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور بہت لوگوں نے مسلمان ہو کر لکھنا پڑھنا سیکھا

حضرت ابوبکر کے جمع قرآن میں تحریر کی تلاش

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قرآن شریف کو جمع کیا۔ تو اس وقت کے واقعات سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی جا چکی تھی۔ اس وقت سورہ توبہ کی دو آیتوں کے متعلق یہ واقعہ پیش آیا۔ کہ باوجود حضرت زید کو یہ علم ہونے کے وہ آیات قرآن شریف کی ہیں۔ اُن کو نہ لیا گیا جب تک وہ لکھی ہوئی نہ ملیں۔ چنانچہ حضرت زید خود یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ جو صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ فتتبعت القران اجمعه ..... حتی وجدت اٰخر سورۃ التوبۃ مع ابی خزیمۃ الانصاری لم اجدها مع احد غیرہ لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حتی خاتمۃ براءۃ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ میں نے قرآن شریف کو تلاش کر کے جمع کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سورہ توبہ کا آخری حصہ مجھے ابو خزیمہ انصاری کے پاس سے ملا۔ جو اور کسی کے پاس نہ تھا اور وہ یہ ہے لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم خاتمہ سورہ براۃ تک" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید کو یہ علم تھا کہ یہ آیتیں سورہ توبہ کے آخر میں ہیں۔ اور پھر اُن کو تلاش کرتے تھے۔ جس سے سوائے اس کے کچھ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ کہ تلاش تحریر کی تھی۔ (دیکھو صحیح بخاری باب جمع القرآن) جس حدیث کا یہ ایک حصہ ہے۔ اس کی تشریح مصنف فتح الباری نے ان الفاظ میں لکھی ہے۔ فلم یامر ابو بکر الا بکتابۃ ما کان مکتوبا ولذالك توقف زید عن کتابۃ الاٰیۃ من اٰخر سورۃ براءۃ حتی وجدها مکتوبۃ مع انه کان یستحضرها هو ومن ذکر معه اور پھر لکھتا ہے۔ وکان القراٰن مکتوبا فی الصحف ولکن کانت مفرقۃ فجمعها ابو بکر فی مکان واحد ترجمہ حضرت ابوبکر صدیق سوائے اس کے جو لکھا ہوا موجود تھا کسی اور شے کے لکھنے کا حکم نہ دیتے تھے۔ یعنی انہوں نے قرآن شریف جمع کرانے میں اتنی بڑی احتیاط فرمائی کہ جس طرح اور جو کچھ آنحضرت صلعم کی حیات میں لکھا جا چکا تھا وہی لکھنے دیا۔ اسی وجہ سے زید کو جو سورہ توبہ کے آخری حصہ

کی آیات کو جانتا تھا۔ کہ یہ بھی قرآن ہی کا حصہ ہیں اُن کے درج کر لینے میں توقف کیا۔ یہاں تک کہ اسے وہ لکھی ہوئی مل گئیں" "اور سارا قرآن قلمی لکھا ہوا تھا۔ مگر یہ قلمی لکھے ہوئے حصے متفرق لوگوں کے پاس تھے۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضہ نے کوشش کر کے انہیں ایک جگہ اکٹھا کر دیا"

طرز تحریر وہی رہی جو آنحضرت کے سامنے تھی

ایک اور روایت ابن ابی داؤد سے یوں آئی ہے قال فامر عمر فقال من کان تلقی من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیئاً من القرآن فلیات بہ وکانوا یکتبون ذلک فی الصحف والالواح والعسب قال وکان لا یقبل من احد شیئاً حتی یشہد شاھدان ترجمہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضہ نے قرآن شریف کو جمع کرنے کا کام ہاتھ میں لیا۔ تو حضرت عمر نے عام طور پر اعلان کر دیا۔ کہ جس کسی کے پاس قرآن شریف کا کوئی حصہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہوا ہے۔ وہ لے آئے۔ ان دنوں میں لوگ قرآن شریف کو کاغذ اور الواح اور کھجور کی ٹہنیوں پر لکھا کرتے تھے۔ کسی شخص سے کوئی حرف بھی لکھا ہوا منظور نہ کیا جاتا تھا جب تک کہ دو گواہوں کی گواہی نہ ہو" فتح الباری میں ہے وکان غرضہم ان لا یکتب الا من عین ما کتب بین یدی النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا من مجرد الحفظ یعنی اس قدر احتیاط سے غرض اُن کی یہ تھی کہ سوائے اس کے کچھ نہ لکھا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے لکھا گیا تھا۔ اور مجرد حافظہ سے کچھ نہ لکھا جائے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والقرآن فی العسب والقضم یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت دنیا سے اٹھائے گئے کہ جب قرآن شریف صرف کھجور کے پتوں اور کھالوں پر لکھا ہوا تھا۔ ان تمام روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت اور ہر ایک سورۃ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے ماتحت آپ کی زندگی میں اور آپ کے سامنے لکھی گئی تھی۔

(۳) وہ دلائل جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سارا قرآن شریف آنحضرت صلعم کی زندگی میں ہی صحابہ رضی اللہ عنہم حفظ کر چکے تھے

قرآن کریم کا حفظ کرنا

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب کبھی کوئی

آیت کریمہ نازل ہوتی تو اسی وقت مجلس میں سب حاضرین کو خواہ وہ دشمن ہوتے یا دوست ضرور سُنا دیا کرتے تھے۔ اور آپ کی مقدس جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض تو وہ تھے۔ جو بہ سبب اکثر آپکی مجلس میں حاضر ہونے کے تازہ وحی الٰہی کو اسی وقت آپ کے دہن مبارک سے سنکر حفظ کر لیتے۔ اور جو حاضر نہ ہوتے وہ دوسروں سے سُن کر حفظ کر لیتے۔ یا لکھوا کر اپنے پاس رکھکر بتدریج حفظ کر لیتے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن کریم صرف چند اخلاقی باتیں اور نیک نصائح یا تمدنی اور فوجداری قوانین کا مجموعہ ہی نہ تھا جس کے مطالب کو یاد رکھنا کافی سمجھا جاتا۔ بلکہ قرآن کریم کے ایک ایک حرف پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اور اُن کے بعد آج تک اہل اسلام کا یہ ایمان رہا ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اور اس پاک کتاب کا ایک ایک لفظ خدا کے منہ سے نکلا ہوا ہے۔ اس لئے اس کو نہایت محفوظ ترین مقام یعنی قلب میں محفوظ رکھنے کی طرف اس قدر متوجہ رہتے۔ قرآنی آیات اُن کی پاک روحوں کی غذا تھی۔ وہ آیات کے نزول کا اس طرح انتظار کرتے رہتے تھے جس طرح ایک سخت پیاسا آدمی پانی کی انتظار کرتا ہے۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بکثرت اسی لئے رہتے تھے کہ جب کوئی تازہ آیت نازل ہو تو اس کو فوراً سن لیں اور حفظ کرنے میں سبقت کریں۔ چنانچہ اکثر کا تو یہ حال تھا کہ کسی قدر کاروبار تجارت وغیرہ بطور حصول معاش کر کے باقی تمام وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گذارتے اور جو اپنے مشاغل ضروری کی وجہ سے غیر حاضر رہتے تھے۔ اُن میں سے بعض نے ایک دوسرے سے ملکر یہ انتظام کیا ہوا تھا۔ کہ باری باری ایک اپنا کام کرآوے اور دوسرا حضور میں حاضر رہے اور اگر کوئی آیت نازل ہو تو اسکو محفوظ کر کے اپنے غیر حاضر بھائی کو پہنچائے۔ اور پھر وہ اپنے کام پر چلا جائے۔ اور دوسرا موجود رہے چنانچہ بخاری میں لکھا ہے۔ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ کے مضافات میں ایسے مقام میں رہتے تھے۔ جہاں ایک انصاری اُن کے ہمسایہ تھے۔ جن کے ساتھ انھوں نے یہ انتظام کیا ہوا تھا کہ دونوں نوبت بہ نوبت آنحضرت صلعم کے دربار میں حاضر رہیں۔ اور جو کچھ سنیں یا دیکھیں اس سے ایک دوسرے کو مطلع کرتے رہیں۔ یعنی ایک روز ایک اپنے معاش کے لئے کام کرتا۔ اور دوسرا دربار نبوت میں حاضر رہتا۔ اور دوسرے روز وہ اپنے کام میں مشغول ہوتا۔ اور اول الذکر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ "جب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں رہتا تو اس دن کی وحی وغیرہ کی تمام خبریں اس دوسرے شخص کو لا سناتا اور جس دِن وہ حاضر دربار رسالت رہتا تو وہ اخبار مجھے لا سناتا۔" (صحیح بخاری) اس کے علاوہ صحابہ

رضی اللہ عنہم میں بعض ایسے بزرگ بھی تھے جو اپنا سارا وقت مسجد نبوی ہی میں گذارتے اور ہر وقت اس بات پر آمادہ رہتے کہ جب کوئی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو اسی وقت یاد کر لیں اُن کا شغل تلاوت قرآن ہی تھا۔

آنحضرت صلعم کا صحابہ کو حفظ و تعلیم قرآن کی رغبت دلانا

خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کے پڑھنے پڑھانے اور یاد کرنے کے لئے بہت سخت تاکید فرماتے رہتے۔ جیسا کہ مسلم کی حدیث ذیل سے ثابت ہوتا ہے عن عقبۃ بن عامر قال خرج رسول اللہ علیہ وسلم ونحن فی الصفۃ فقال ایکم یحب ان یغدو کل یوم الیٰ بطحان او العقیق فیاتی بناقتین کوماوین فی غیر اثم ولا قطع رحم قلنا یا رسول اللہ کلنا نحب ذٰلک قال افلا یغدو احدکم الی المسجد فیعلم او یقرأ اٰیتین من کتاب اللہ خیر لہ من ناقتین وثلٰث خیر لہ من ثلث واربع خیر لہ من اربع ومن اعدادھن من الابل (رواہ مسلم) یعنی عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ ایک روز حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور ہم اس وقت صفہ میں تھے۔ آپ نے پوچھا کہ تم میں سے کون اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ ہر روز بطحان یا عقیق کو جائے اور بڑی کوہان والی دو اونٹنیاں بغیر کسی کو گزند پہنچائے گناہ کئے اور قطع رحم کئے لائے۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم سب اس بات سے محبت رکھتے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی صبح کو مسجد میں آکر کتاب اللہ (قرآن کریم) کی دو آیتیں پڑھاتا یا پڑھتا نہیں۔ جو اس کے لئے دو اونٹنیوں سے بڑھ کر ہیں۔ اور تین آیتیں تین اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔ اور چار آیتیں چار اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔ جتنی آیتیں پڑھے گا پڑھائے گا اتنے ہی اونٹوں سے بہتر ہونگی۔ ایسا ہی بخاری میں یہ حدیث آئی ہے۔ عن عثمان رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیرکم من تعلم القراٰن وعلمہ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کہا فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تم سب سے بہتر وہی ہے جو قرآن شریف کو سیکھتا اور سکھاتا ہے۔ ایسا ہی بخاری اور مسلم دونوں میں یہ حدیث صحیح موجود ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے ہے۔ عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الماھر بالقراٰن مع السفرۃ الکرام البررۃ والذی یقرأ القراٰن یتتعتع فیہ وھو علیہ شاق لہ اجران یعنی قرآن کے ماہر اُن کے ساتھ ہیں جو بہت عزت والے اور بزرگ ہیں۔ اور جو شخص قرآن شریف کو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے۔ اور نہایت مشکل سے اس کے حروف کو ادا کرتا ہے تو اس کے لئے دو چند اجر ہے۔ ایک اور حدیث یہ ہے۔ عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

لاحسد الا علی اثنین رجل اٰتاہ اللہ القراٰن فھو یقوم بہ اٰناء اللیل و اٰناء النہار ورجل اتاہ اللہ مالا فھو ینفق منہ اٰناء الیل و اٰناء النہار یعنی ابن عمر سے روایت ہے کہ کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ رشک دو آدمیوں کے ساتھ کرنا جائز ہے۔ ایک تو اس شخص کے ساتھ جسے اللہ نے قرآن پڑھایا ہو اور وہ دن رات اس کی تلاوت میں مشغول ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ دوسرے اس آدمی کے ساتھ جسے خدا نے مال دیا ہو۔ اور وہ رات دن اسے خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہو۔ پھر ابو موسیٰ اشعری کی روایت سے ایک حدیث آئی ہے عن ابی موسی الاشعری عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال المؤمن الذی یقرأ القراٰن کالاترجۃ طعمہا طیب وریحہا طیب والمؤمن الذی لا یقرأ القراٰن کالتمرۃ طعمہا طیب ولا ریح لہا یعنی ابو موسیٰ اشعریؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ مومن جو قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال نارنجی کی طرح ہوتی ہے۔ کہ اس کا ذائقہ بھی خوشگوار اور خوشبو بھی طیب ہوتی ہے اور جو مسلمان قرآن نہیں پڑھتا اس کی حالت کھجور سے مشابہ ہوتی ہے۔ جس کا ذائقہ تو اچھا ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی خوشبو نہیں ہوتی۔ اب اس آخری حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو گروہوں میں تمیز کر دی ہے یعنی ایک تو وہ گروہ علیحدہ بیان کیا ہے جو صرف قرآن شریف پر عمل ہی کرتا ہے۔ اور اس کی تلاوت میں غفلت کرتا ہے۔ ایسے گروہ کو بے خوشبو کہا ہے۔ اور دوسرا وہ گروہ اس پہلے گروہ سے ممتاز کیا ہے جو عمل بھی کرتا ہے اور تلاوت بھی کرتا رہتا ہے۔ اس گروہ کو خوشبودار ثمر سے مشابہت دی ہے۔ اور اس کی ترجیح بیان فرمائی ہے اس سے اور نیز دوسری حدیثوں سے نہایت صفائی سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف قرآن شریف پر عمل کرنے کی تاکید ہی نہ فرماتے تھے بلکہ تلاوت قرآن شریف کی بھی اسی قدر تاکید فرماتے تھے۔ آنحضرت صلعم کی تعلیم میں حفظ قرآن کو جس احتیاط اور التزام کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سے قرآن پر عمل کرنے کے پہلو کو کہیں جدا نہیں کیا گیا۔ اصل علت غائی حفاظت اور تلاوت کی یہی ہے کہ اس کو عملی زندگی میں ہمیشہ زندہ رکھا جاوے۔ اور جذب برکات و نفحات اور کشف و اخذ انوار ربانی اور تزکیہ نفس اور حصول معرفت وقرب الٰہی کے لئے بار بار پڑھ کر اس پر تدبر اور تفکر کیا جائے۔

احادیث میں حفظ قرآن کی تاکید

ہم نے مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق پر عمل کیا ہے۔ ورنہ جس قدر تاکیدی احکام قرآن شریف کی تلاوت پر مداومت کے متعلق احادیث میں پائے جاتے ہیں۔ اور جتنی اہمیت اس امر کو دی گئی ہے اُن صحیح اور مستند روایات کا کتب احادیث میں اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ اُن کا بیان

نقل کرنا باعث طوالت ناظرین کی ملالت کا باعث ہوگا۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں استذکار اور تعاہد قرآن پر ایک علیحدہ باب باندھا ہے۔ اس باب میں بہت سی احادیث اس مضمون کی ہیں کہ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت قرآن پر مداومت کی تاکید فرمائی ہے ایسا ہی ایک اور باب بعنوان "تعلیم الصبیان القرآن" قایم کیا ہے۔ جس میں قرآن کریم کے اولاد کو تعلیم کرنے کے احکام ہیں۔ اور ایک تیسرا باب بعنوان "خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ" قایم کیا ہے۔ یعنی بہترین انسان وہ ہے جو قرآن شریف پڑھتا اور پڑھاتا ہے اور ایک چوتھا باب "القراۃ عن ظہر القلب" یعنی قرآن شریف کو زبانی یاد کرنے کے احکام اور مراتب کے متعلق باندھا ہے۔ مسلمانوں میں تنقید وتحقیق وصحت روایات کے لحاظ سے بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ مانا گیا ہے۔ اور اس کتاب میں ہم اس قدر احادیث پاتے ہیں کہ ان سب کا نقل کرنا مشکل ہے اس لئے بنظر اختصار اس جگہ صرف ابواب کے نام لکھ دینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اور ان تمام احادیث کا مفصلاً ذکر نہیں کرتے۔ ابواب کے نام ہی اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حفظ کرنے کی ہر مومن کو تاکید اکید فرماتے رہتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو یاد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے انہی احکام کی تعمیل میں پہلے زمانوں کے مسلمان اگر سارا نہیں تو بعض بعض حصص قرآن شریف کے ضرور یاد کر لیا کرتے تھے۔ اگرچہ اس زمانہ میں بھی ہر ایک اسلامی ملک میں ہزارہا حافظ قرآن شریف کے اور قاری موجود ہیں۔ جو سارا قرآن شریف کمال صحت کے ساتھ حافظہ میں یاد رکھتے ہیں جن کی مثال دنیا کی کسی غیر اسلامی قوم میں موجود نہیں۔ لیکن عرب کے خاص حالات ایسے تھے کہ انکے لئے قرآن شریف کو ازبر کرنا بہت ہی آسان تھا۔ چنانچہ ولیم میور جیسا معاند اور مخالف اسلام بھی اپنی کتاب لائف آف محمدؐ کے دیباچہ کے صفحہ ۱۶ پر اسی خصوصیت کو تسلیم کرتا ہوا لکھتا ہے "عرب لوگ نظم کے بہت سرگرم اور جاندادہ مشتاق تھے۔ لیکن اُن کے پاس ایسے اسباب موجود نہ تھے کہ جن سے وہ اپنے شاعروں کے کلام کو ضبط تحریر میں لا سکتے۔ اس لئے بہت مدت تک اُن میں یہی رواج رہا۔ کہ اپنے شعرا کے کلام اور اپنی قوم اور آباواجداد کے تاریخی واقعات کو دل کی زندہ الواح پر ہی بہت عمدگی اور صحت کے ساتھ طبع کر لیتے۔ اس طرز سے ان میں قوت حافظہ کمال درجہ ترقی پر پہنچ گئی ہوئی تھی۔ اور یہی قوت حافظہ اس نئی پیدا شدہ روح کے ساتھ پورے اخلاص اور شوق سے قرآن کریم کے حفظ کرنے میں کام آئی"۔

عہد ابتدا حاصل کرنے میں تحریص حفظ قرآن

ہم نے چند احادیث جو اوپر لکھی ہیں اُن سے یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ آنحضرت صلعم یہ بھی چاہتے

تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم علم قرآن میں ایک دوسرے پر فوقیت اور سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی چند ایسے اسباب موجود تھے کہ جن کی وجہ سے قرآن شریف کے حفظ کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لئے صحابہ کوشش کرتے رہتے تھے۔ از انجملہ ایک یہ بات بھی کہ نمازوں میں امامت کرانے کے لئے وہ شخص ہی معزز عہدۂ امامت کے لئے منتخب کیا جاتا تھا جو دوسروں سے علم قرآن میں بڑھا ہوا ہو۔ چنانچہ اس عزت کو حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے بڑھ کر قرآن شریف کو یاد کرنے میں محنت کرتا۔ تمام صحیح احادیث اسی بات کو ثابت کرتی ہیں یہ امامت دراصل مسلمانوں میں ایک نہایت عزت کا مقام اور اعلیٰ مرتبہ تھا۔ خود حضور صلعم بھی امام تھے لہٰذا شریعت اسلامی میں اس امامت کے معزز اور مفتخر عہدہ پر ماموریت کا قرعہ اسی شخص کے حق میں بلا لحاظ قومیت و وجاہت و عمر پڑتا جو علم قرآن میں دوسروں سے بڑھا ہوا ہوتا۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے عن عمرو بن سلمۃ قال کنا بحاضر یمر بنا الناس اذا اتوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فکانوا اذا رجعوا مروا بنا فاخبرونا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کذا وکذا وکنت غلاما حافظا فحفظت من ذلک قرآنا کثیرا فانطلق ابی وافدا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی نفر من قومہ فعلمھم الصلوۃ وقال یؤمکم اقرؤکم فکنت اقرؤھم لما کنت احفظ فقدمونی فکنت اؤمھم یعنی عمرو بن سلمہ سے روایت ہے کہ ہم (یعنی ہماری قوم) ایک دفعہ کسی مقام پر ڈیرہ افگن ہوئی جو پانی کے قریب تھا۔ اور جو لوگ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور میں جاتے وہ اسی راہ سے جاتے تھے جو ہمارے پاس سے گذرتا تھا۔ جب وہ واپس آتے تو ہمیں تمام وحی جو حضور صلعم سے تازہ سنکر آتے سنا جاتے تھے۔ میں ابھی بچہ ہی سا تھا (قریب آٹھ سال کے عمر تھی) پر میری قوت حافظہ بہت تیز تھی۔ جو جو میں سنتا جاتا تھا حفظ کرتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اکثر حصہ قرآن شریف کا اسی طرح ان لوگوں سے ہی میں نے یاد کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد میرا باپ اپنی قوم کے بہت سارے عمائد کو ساتھ لیکر اسلام قبول کرنے کے لئے حضرت سرور کائنات صلے اللہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں آنحضرت صلعم نے انہیں داخل اسلام فرمایا۔ اور اُن کو نماز کی تلقین فرمائی اور حکم دیا کہ تم میں نماز میں امامت وہ شخص کرایا کرے جو سب سے زیادہ قرآن جانتا ہو۔ چونکہ میں نے قرآن کا بہت حصہ پہلے ہی حفظ کیا ہوا تھا۔ اس لئے امامت کا حق میرا ہی تھا۔ پس مجھے ہی سب نے امام منتخب کیا۔ اور میں ہی نمازوں میں اُن کا امام ہوتا رہا" یہ حدیث ابوداؤد میں درج ہے۔ اور بخاری اور دوسرے محدثین نے بھی اس کو لکھا ہے۔ ایسا ہی جب کبھی کوئی نئی قوم اسلام میں داخل ہوتی تو اُن میں امامت

کے فرائض ادا کرنے اور مسائل اسلام کی تلقین و تعلیم دینے کے لئے وہی شخص بھیجنے کے لئے منتخب کیا جاتا تھا جو علم قرآن میں فایق اور سابق ہوتا تھا +

کثرت تلاوت قرآن میں آنحضرت صلعم کا نمونہ

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خلوت و جلوت میں قرآن شریف کی اکثر تلاوت فرماتے رہتے۔ اور اپنا نمونہ پیش کرتے رہتے تھے۔ ناظرین یہ خیال نہ کریں کہ آنحضور صلعم صرف نمازوں ہی میں لمبی لمبی سورتیں پڑھنے پر اکتفا کیا کرتے تھے۔ بلکہ ہمارے سامنے ایسے کئی واقعات موجود ہیں کہ سفر کو جاتے ہوئے اونٹ پر سواری کی حالت میں کئی سورتیں پڑھ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ بخاری میں یہ روایت ہے رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم فتح مکۃ وھو یقرأ علی راحلتہ سورۃ الفتح یعنی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کے روز دیکھا۔ کہ آپ اپنے اونٹ پر سوار تھے تو آپ نے سورہ الفتح پڑھی۔ آنحضور صلعم کو دوسروں سے قرآن سننے سے بھی بڑی محبت تھی۔ اور یہ محبت آپ میں ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر بھی صحابہ کا قرآن کریم پڑھنا سنا کرتے تھے۔ چنانچہ بخاری باب نسیان القرآن میں اس قسم کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ کہ ایک دفعہ رات کو جب ایک شخص نماز میں قرآن پڑھ رہا تھا تو آپ سُن رہے تھے۔ اسی طرح بخاری میں یہ روایت بھی درج ہے عن عبد اللہ قال قال لی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اقرأ علیّ قلت یا رسول اللہ اقرأ علیک وعلیک انزل قال نعم فقرات سورۃ النساء حتی اتیت علی ھذہ الآیۃ فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید وجئنا بک علی ھؤلاء شہیدًا - قال حسبک الآن فالتفت الیہ فاذا عیناہ تذرفان - یعنی عبد اللہ سے روایت ہے کہ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ مجھے فرمایا کہ کچھ قرآن سناؤ۔ میں نے جواب میں عرض کیا کہ حضور کیا میں آپ کو سناؤں اور آپ پر تو نازل ہوا ہے؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ ہاں (اور دوسری روایت میں ہے کہ مجھے یہ اچھا لگتا ہے کہ دوسرے کو پڑھتا سنوں) یہ بات سُن کر میں نے سورہ النساء پڑھنی شروع کی یہاں تک کہ جب میں اس آیت پر پہنچا فکیف اذا جئنا الآیۃ تو آپ نے فرمایا کہ اس وقت بس کرو۔ جب میں نے آپ کی طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو چل رہے تھے۔

ختم قرآن کی میعاد سے حفظ قرآن کی شہادت

تلاوت میں کثرت کا صحابہ کو اتنا شوق تھا کہ بعض صحابی ہر رات قرآن شریف ختم کر لیا کرتے تھے اور یہ حالت دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انہیں ایسا طریق اختیار کرنے کی ہدایت دینی پڑی کہ جو اُن پر بار نہ ہو۔ چنانچہ بخاری میں ایک باب اس مضمون پر ہے کہ کتنے دنوں میں قرآن ختم کرنا چاہئے اس باب میں ایک حدیث وارد ہوئی ہے کہ ایک صحابی کی نسبت آنحضرت صلعم کو معلوم ہوا کہ وہ

ہر رات قرآن شریف کا ختم کرتا ہے۔ اس پر آپ نے اسے بلا کر ہدایت فرمائی کہ قرآن پڑھنے میں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ آہستگی سے تلاوت کرنی چاہئے۔ ایک رات میں نہیں بلکہ سات دنوں میں یا پانچ دنوں میں یا کم از کم تین دنوں میں ختم کرنا چاہئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ صحابہؓ میں ایسے بزرگ بھی موجود تھے جنہیں قرآن شریف کے حفظ پر اتنی دسترس تھی کہ وہ ایک رات میں ہی سارا قرآن ختم کر لیا کرتے تھے۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس حکم دینے سے کم از کم تین دنوں میں قرآن ختم کرنا چاہئے یہ منشا تھی کہ قرآن کو طوطے کی طرح بلا مطلب سمجھے نہیں پڑھتے رہنا چاہئے۔ بلکہ اس کو غور و خوض اور تدبر و تفکر سے پڑھنا چاہئے۔ ایک اور حدیث جو مسند دارمی میں ہے یوں ہے عن عبد اللہ بن عمرو قال یا رسول اللہ فی کم اختم القرآن قال اختمہ فی شھر قلت انی اطیق قال اختمہ فی خمسۃ وعشرین قلت انی اطیق قال اختمہ فی عشرین قلت انی اطیق قال اختمہ فی خمس عشرۃ قلت انی اطیق قال اختمہ فی عشر قلت انی اطیق قال اختمہ فی خمس قلت انی اطیق قال لا یعنی عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے۔ کہ اس نے حضور صلعم سے عرض کیا یا رسول اللہ! میں کتنے عرصہ میں قرآن ختم کیا کروں فرمایا کہ ایک ماہ میں اس نے عرض کیا کہ میں اس سے جلدی ختم کر سکتا ہوں۔ فرمایا پچیس دنوں میں ختم کیا کرو۔ اس نے عرض کیا کہ میں تو اس سے بھی جلدی ختم کر سکتا ہوں۔ فرمایا بیس دنوں میں ختم کیا کرو۔ اس نے عرض کیا کہ میں اس سے بھی جلدی ختم کر سکتا ہوں۔ فرمایا پندرہ دنوں میں ختم کیا کرو۔ اس نے عرض کیا کہ میں اس سے بھی جلدی ختم کر سکتا ہوں۔ فرمایا دس دنوں میں ختم کیا کرو۔ اس نے عرض کیا کہ میں اس سے بھی جلدی ختم کر سکتا ہوں فرمایا پانچ دنوں میں ختم کیا کرو۔ اس نے عرض کیا میں اس سے بھی جلدی ختم کر سکتا ہوں تو پھر آپ نے فرمایا بس۔ یعنی اب اس سے کم میعاد نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہی فتح الباری شرح صحیح البخاری جلد ۹ صفحہ ۵۳ پر یہ حدیث منقول ہے۔ عن ابن مسعود اقرؤا القرآن فی سبع ولا تقرؤہ فی اقل من ثلث یعنی قرآن کریم کو سات دنوں میں پڑھا (ختم کیا) کرو اور تین دنوں سے کم مدت میں ہرگز ختم نہ کرو۔ ایسا ہی اسی کتاب میں ایک اور حدیث منقول ہے جو یہ ہے عن عائشۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یختم القرآن فی اقل من ثلث یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کو تین دنوں سے کم عرصہ میں ختم نہیں کیا کرتے تھے۔

صحابہ میں حافظانِ قرآن کی کثرت

اکثر معتبر اور صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی کثیر

جماعت کو قرآن کریم حفظ تھا چنانچہ قرّا کی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔ قرّاء کا اصل مفہوم یہ ہے "قرآن شریف اوروں کو سکھانے کے لئے حفظ کرنے والے لوگ" چنانچہ صاحب فتح الباری نے لفظ قرّاد کے یہی معنی کئے ہیں۔ قرّائ کے معنی یہ ہیں۔ الذین اشتہروا بحفظ القرآن والتصدی لتعلیمہ۔ "وہ لوگ جو قرآن شریف کو حفظ کرنے اور دوسروں کو قرآن شریف سکھلانے کے لئے مشہور تھے"۔ اس میں شک نہیں کہ اس لفظ کے ذیل میں آنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ انہیں کامل طور پر علم قرآن بھی ہو۔ احادیث سے ثابت ہے کہ ستر قرّا کو کفار نے آنحضرت صلعم کے زمانہ میں بئر معونہ کے قریب قتل کر دیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حافظان قرآن کی صحابہ میں کیسی کثرت تھی "باب القرّاء من اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم" کی ذیل میں حضرت امام بخاری نے بہت سی احادیث بیان فرمائی ہیں۔ ازانجملہ ایک یہ ہے ذکر عبد اللہ بن عمرو عبد اللہ بن مسعود فقال لا ازال احبہ سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول خذوا القرآن من اربعۃ من عبد اللہ بن مسعود وسالم ومعاذ وابی بن کعب یعنی عبد اللہ بن عمرو نے عبد اللہ بن مسعود کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں ہمیشہ اس سے محبت کرتا رہونگا۔ کیونکہ میں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بات فرماتے سنا ہے کہ چار آدمیوں عبد اللہ بن مسعود وسالم ومعاذ وابی ابن کعب سے قرآن سیکھو۔ اس حدیث سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ قرآن کا علم اور قرآن کی تعلیم دینا انہیں چار بزرگوں میں محدود تھا۔ اور دوسرے صحابہ میں یہ قابلیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ اور نہ ہی اس حدیث کے الفاظ میں یہ بات موجود ہے کہ گویا ان چاروں کے سوائے کوئی دوسرا صحابی قرآن کو یاد نہ رکھتا تھا۔ اور اس کو پڑھا نہ سکتا تھا۔ یہ بات ثابت ہے کہ تمام صحابہ قرآن شریف کا کچھ نہ کچھ حصہ جانتے تھے۔ اور یہ امر بھی عیاں ہے کہ ان میں کثیر التعداد ایسے لوگ تھے۔ جو قرآن شریف کے حافظ تھے۔ لیکن قرآن شریف کا معلم بننے کے لئے ضروری ہے کہ اس شخص میں فہم قرآن بھی اعلیٰ درجہ کا ہو۔ اور علم قرآن بھی بہت بڑھکر ہو۔ اس حدیث میں اُن لوگوں کی معلمیت کی حیثیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان کی اس قابلیّت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی وہ لوگ اچھی طرح قرآن سکھانے کی قابلیت رکھتے تھے اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ قرآن شریف کی تمام سورتوں کو اچھی طرح سکھا سکتے تھے۔ اس لئے خود پورے قرآن شریف کے حافظ تھے۔ اور ایک یہ وجہ بھی ہے کہ صحابہ کی جماعت بہت کثیر تھی۔ اس لئے ہر ایک آدمی کو یہ موقعہ میسر نہیں آسکتا تھا۔ کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی سے آیات قرآنی سن سکتا۔ اکثر نے اگر کچھ حصہ آنحضرت صلعم سے سنا بھی ہوگا تو کثیر حصہ بالواسطہ سیکھا۔ پس شاید ان چار کا نام اسواسطے لیا گیا کہ

انہوں نے اکثر حصہ قرآن شریف کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے بلاواسطہ سنا اور سیکھا تھا۔ چنانچہ ان میں سے ایک عبداللہ بن مسعود اس سے اگلی حدیث میں کہتے ہیں کہ میں نے ستر سے زیادہ سورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ حاصل کیں۔

حضرت ابوبکر کی فضیلت علم قرآن میں

غرض اسی قسم کی کوئی خصوصیتیں ہونگی جن کی وجہ سے آنحضرت صلعم نے ان چاروں کا نام اس حدیث میں لیا ہے، ورنہ احادیث صحیحہ معتبرہ سے ثابت ہے کہ صحابہ میں بکثرت ایسے لوگ موجود تھے جن کو نہ صرف قرآن شریف ازبریاد ہی تھا۔ بلکہ اُن کو فہم قرآن بھی اعلیٰ درجہ کا عطا کیا گیا تھا۔ ان لوگوں میں سے بطور مثال ہم حضرت ابوبکر صدیق ہی کا نام نامی پیش کرتے ہیں۔ حضرت صدیق صاحب کمالات ظاہری و باطنی یار غار رسول کریم صلعم تھے اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی قرآن دانی اور قرآن فہمی کا سب سے فایق ہونا کئی موقعوں پر بیان فرمایا۔ مثلاً آپ کے آخری ایام کے ہی چند واقعات لے لو۔ آخری ایام کے واقعات ہم اس لئے لیتے ہیں کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ شاید بعد میں دوسرے صحابہ نے فوقیت حاصل کر لی ہو۔ ان واقعات میں سے ایک واقعہ تو یہ ہے کہ جب سورہ النصر نازل ہوئی تو ذکر ہے کہ حضرت ابوبکر رو پڑے۔ جب بعض لوگوں نے تعجب کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر تم سے بہتر قرآن سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس سورہ میں یہ اشارہ تھا کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے کوچ کر جانے کا وقت قریب آگیا ہے اور اسی لئے حضرت ابوبکر رو بھی پڑے تھے۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا۔ کہ مسجد میں جس قدر دریچے ہیں وہ سب بند کر دیئے جائیں۔ سوائے حضرت ابوبکر کے دریچہ کے۔ اس میں بھی یہ اشارہ تھا کہ جو دسترس آپ کو علم قرآن میں حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں۔ تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آخری بیماری کے دنوں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے انہی کو امام مقرر فرمایا۔ اب یہ بات صحیح اور معتبر احادیث سے ثابت ہے۔ کہ نمازوں کے لئے امام وہی شخص منتخب ہونا چاہئے جو سب سے بڑھ کر علم قرآن میں فوقیت رکھتا ہو جب کہ امامت کے لئے قرآن شریف کے علم میں برتری ایک شرط اولیٰ آپ نے ہمیں بتلائی تو جس شخص کو آپ نے امامت کے لئے منتخب کیا ضرور ہے کہ اس کو علم قرآن میں تمام جماعت صحابہ پر ہر طرح کی فوقیت آپ کے نزدیک مسلم ہو۔ یہاں تو ابوبکرؓ کو سب صحابہؓ میں سے بڑھ کر قرآن جاننے والا مانا گیا۔ لیکن وہاں اس حدیث میں جہاں چاروں کا ذکر کیا گیا ہے اُن کا گرامی اسم نہ بیان کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس حدیث میں جن ناموں کا ذکر ہے وہ حصر کے طور پر نہیں بلکہ کسی خصوصیت کی وجہ سے ہے۔ اس میں شک نہیں

کہ حضرت ابوبکر صدیق قرآن شریف کے حافظ بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بھی بنا رکھی تھی۔ جس میں وہ ہر روز بلاناغہ بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ بلکہ کفار نے ان کو ایک دفعہ اس سے روکا بھی تھا۔ اور یہ کہا تھا کہ اس طرح قرآن شریف سنا سنا کر تم ہماری عورتوں اور بچوں کو مسلمان کر لوگے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضور سرور کائنات صلعم کے حضور میں ہر وقت کی حاضر باشی کا شرف اُن کو سب سے بڑھ کر نصیب ہوا۔ ان امور سے صاف طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق قرآن شریف کے حافظ بھی تھے۔ اور فہم و علم قرآن میں تمام صحابہ سے بڑھے ہوئے تھے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو منصب امامت اور جادہ خلافت پر ممتاز نہ فرماتے۔

حافظان قرآن کے نام

اسی طرح عبداللہ بن عمرو نے ایک حدیث بیان کی ہے جو نسائی میں موجود ہے اور جس کے راوی معتبر تسلیم کئے گئے ہیں۔ اور وہ یہ ہے عن عبد اللہ بن عمرو قال جمعت القرآن فقرات فی کل لیلۃ فبلغ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اقرا فی شھر یعنی عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ میں نے سارا قرآن اپنے حافظہ میں جمع کر لیا۔ یعنی ازبر کر لیا اور میری عادت تھی کہ ہر رات ایک ختم قرآن کر چھوڑا کرتا تھا۔ اس امر کی اطلاع حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو گئی تو آپ نے مجھے ہدایت فرمائی کہ ایسا مت کیا کرو بلکہ قرآن شریف کو ایک مہینے میں ختم کیا کرو" غرض اسی طرح صحابہ کبار کی جماعت میں بہت سے صحابی ایسے ثابت ہوتے ہیں جن کو قرآن شریف ازبر تھا۔ اور چاروں خلیفے یعنی حضرت ابوبکر صدیق۔ حضرت عمر فاروق۔ حضرت عثمان۔ حضرت علی۔ اور طلحہ۔ سعد۔ ابن مسعود۔ سالم۔ رضی اللہ عنہم کے نام حافظان قرآن میں صحیح روایات میں موجود ہیں۔ مرد تو خیر قرآن شریف کے حافظ اور عالم تھے ہی صحابیہ عورتیں بھی اس کے حفظ کرنے کی عزت سے محروم نہ رہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ حضرت حفصہ اور حضرت ام سلمہ وغیرہ کے گرامی اسماء تاریخ کی اس فہرست کو زینت دے رہے ہیں۔ مہاجرین کے علاوہ انصار میں بھی قرآن شریف کے لئے ایسی ہی محبت اور شوق تھا۔ لیکن اس جگہ فہرست دینے سے طول ہوتا ہے۔ یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں بے سمجھی سے کام لینے والے منصب لوگ یہی نہ سمجھ لیں کہ قرآن کریم کے حافظ صرف اتنے لوگ ہی تھے جن کے نام لکھے گئے ہیں۔ ایسا گمان واقعات سے بہت بعید ہو گا۔ کیونکہ ابھی ہم دکھلا آئے ہیں کہ صرف ایک ہی موقعہ پر کفار نے ستر قرا کو قتل کر دیا تھا جس سے کثرت قرا کا ثبوت کافی طور پر ملتا ہے ان کے علاوہ غزوہ یمامہ میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تھوڑے دن بعد واقعہ ہوا قریباً اسی قدر قراء شہید ہوئے

جن میں مذکورین کے زمرہ سے حضرت سالم تھے۔ جب جنگ یمامہ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا کہ جنگ یمامہ میں ہمارے اکثر قرّا کام آگئے۔ اس لئے اب ضروری ہے کہ قرآن شریف ایک ہی جلد میں جمع کر دیا جائے۔ تو اس موقعہ پر انہوں نے صرف سالم کا نام نہ لیا تھا۔ بلکہ کہا تھا کہ قال ابوبکر ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامۃ بقراء القراٰن یعنی حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ حضرت عمر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ غزوہ یمامہ میں قرآن شریف کے قراء بہت سے قتل ہو گئے ہیں۔ اگر صرف وہی لوگ حافظ اور قُرّاء قرآن ہوتے جن کے نام لکھے گئے ہیں تو حضرت عمر کو چاہئے تھا کہ صرف سالم ہی کا نام لیتے۔ کیونکہ نامزدہ لوگوں سے تو صرف ایک سالم ہی وہاں کام آئے تھے۔ مگر حضرت عمر کے الفاظ سے یہ بات پائی جاتی ہے۔ کہ وہاں کثرت سے حافظ شہید ہو گئے۔ جس سے یہ بات بین طور پر ثابت ہوتی ہے کہ قُرّاء و حفاظ قرآن بکثرت تھے۔

قوم خزرج کے چار جامعین قرآن

بخاری میں ایک یہ حدیث منقول ہے عن انس قال مات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولم یجمع القراٰن غیر اربعۃ ابو درداء ومعاذ بن جبل وزید بن ثابت وابو زید۔ یعنی انس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور سوائے چار اشخاص ابو درداء و معاذ بن جبل و زید بن ثابت و ابو زید کے کسی نے قرآن جمع نہ کیا۔ اور ایک روایت میں جو بخاری ہی میں ہے بجائے ابو درداء کے ابی ابن کعب کا نام ہے جمع کے عام معنی تو احادیث میں کتاب کی صورت میں جمع کرنے کے ہی آئے ہیں۔ پس اگر یہی معنے اس حدیث میں مراد لئے جائیں تو اس سے قرآن شریف کے حافظوں کی تعداد کا حصر نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی تعارض اُن احادیث صحیحہ سے واقع ہوتا ہے۔ جو اوپر نقل کی گئی ہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگر چار آدمی قرآن شریف کو ایک جا جمع کر چکے تھے۔ اور کتاب کی صورت میں کلام اُن کے پاس موجود تھا تو حضرت عمر نے اتنا خوف کیوں ظاہر کیا۔ اور حضرت زید نے اس کام کو اتنا مشکل کیوں سمجھا سو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر یا حضرت ابوبکر اور زید کا منشا ان اصل مسودات کو جمع کرنا تھا۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق آپکے کاتبوں نے لکھے تھے۔ اس لئے اُن کا مطلب اس سے حل نہ ہوتا تھا۔ کہ کسی کا اپنے طور پر جمع کیا ہوا قرآن شریف اُن کو مل جائے۔ اور یہی معنی اس حدیث کے کرنے پڑیں گے۔ جس میں یہ لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور قرآن شریف کسی چیز میں جمع نہ تھا۔ یعنی مطلب اسکا یہ ہوگا کہ وہ مسودات جو آنحضرت کی ہدایت کے مطابق لکھے گئے تھے وہ ایک جگہ جمع نہ کئے گئے تھے۔ اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اس سے صحیح اور معتبر احادیث میں کسی قسم کا تعارض باقی نہیں رہتا۔ اور اگر

لفظ جمع کے دوسرے معنے مراد لئے جاویں یعنی کل قرآن شریف کا حفظ کرنا تو اس صورت میں حدیث کے معنی سمجھنے کے لئے پہلے واقعات کو دیکھنا چاہئے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ یثرب میں (جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے مدینہ منورہ ہوگیا) دو قومیں خزرج اور اوس رہتی تھیں۔ ان دو قوموں میں عرب جاہلیت کے زمانہ کی طرح باہمی سخت عداوت اور بغض تھا۔ پھر جب یہ دونوں قومیں مسلمان ہوگئیں تو اُن میں سے دشمنی دور ہوگئی۔ اور سب ایک دوسرے کے بھائی ہوگئے۔ لیکن ترقیات دینی میں رشک ضرور رہا۔ حضرت انس قوم خزرج میں سے تھے۔ ایک موقعہ پر قوم اوس کے بعض افراد نے اپنے چار آدمیوں کی نسبت بڑے فخر سے ذکر کیا۔ اور اُن کی شہرت اور عظمت پر بڑا ناز ظاہر کیا۔ اس فخریہ بات کا جواب دوسری رقیب قوم کی طرف سے بھی ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت انس نے اپنی قوم کے چار آدمیوں کے نام لیکر اُن کی ایک بہت بڑی خدمت اسلام اور بڑا نمایاں کام بیان کیا۔ یعنی قوم خزرج میں سے یہ چار ایسے بزرگ ہوئے ہیں کہ جنہوں نے قرآن شریف کو جمع کیا۔ جس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ اُن کو قرآن شریف از بر تھا۔ اور یا یہ کہ انہوں نے متفرق مسودوں سے خود قرآن شریف کو نقل کر لیا ہوا تھا۔ غرض بہرحال حضرت انس کا یہ بیان تو صرف ایک رقیب قوم کے مقابل میں بطور جواب تھا جب اس بات پر غور کی جاتی ہے کہ یہ چاروں بزرگ جن کا نام حضرت انس نے اپنی روایت میں لیا ہے اُن کی ہی قوم میں سے تھے۔ تو اس بات کے ثبوت پر زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے۔ ورنہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو عبداللہ بن مسعود اور سالم اور کئی دوسرے مشہور انصار و مہاجرین کے ناموں کو چھوڑ کر انہی چاروں پر حصر کر لینا کہاں درست ہو سکتا تھا۔ وہ تو ایسے بزرگ تھے کہ جن کی قرآن دانی آفتابِ عالمتاب کی طرح مسلم اور روشن ہے۔ اور حضرت انس ایسے ناواقف نہ تھے کہ اگر کلیہ طور پر روایت کرتے تو مشاہیر قرآن دانوں اور جامعانِ قرآن کے اسماء کو ناواقفیت کی وجہ سے چھوڑ دیتے۔ پس ظاہر ہے کہ یہ کلمات اُن کے اپنی قوم کی عظمت قوم اوس کے مقابلہ پر ظاہر کرنے کے لئے تھے۔

نماز سے حفظ قرآن میں مدد

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ قرآن شریف کا یاد کرنا بعض اغراض کے لئے ہر مسلمان کے لئے لازمی تھا خواہ اس کا تھوڑا حصہ یاد کرے یا بہت یا سارا ہی کرے۔ کیونکہ ہر مسلمان پر نماز ایک ضروری فرض ہے۔ اور نماز میں قرآن شریف ضروری طور پر پڑھا جاتا ہے۔ بغیر قرآن شریف کے بعض حصص پڑھنے کے نماز ہوتی ہی نہیں گویا نماز پڑھنے کا حکم من وجہ قرآن کے کل یا جزو کے حفظ کرنے کا حکم ہے۔ جو ہر مسلمان پر مسلمان رہنے کے لئے فرض ہے۔ اور نماز صرف ایک دفعہ ہی نہیں بلکہ دن میں کم از کم

پانچ دفعہ پڑھی جاتی ہے۔ اور ہر دفعہ کی نماز میں کئی کئی رکعتیں ہوتی ہیں۔ اور عموماً ہر رکعت میں علاوہ معینہ سورہ قرآن یعنی فاتحہ کے کوئی نہ کوئی حصہ قرآن شریف کا ضرور پڑھنا پڑتا ہے۔ صحابہ کی نسبت ثابت ہے، کہ وہ عموماً نمازیں دل کے سچے لگاؤ سے پڑھا کرتے تھے اور خشوع خضوع سے اپنے اس فرض کو ادا کیا کرتے تھے۔ اور نماز کو اپنا ہتھیار اور خدا سے قرب کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ اُن کی نسبت یہ ثابت ہے کہ وہ نمازوں میں دیر تک قیام کیا کرتے اور زیادہ لمبے عرصہ تک قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ ان پانچوں نمازوں کے علاوہ ایک اور نماز ہے جو رات کے آخری حصہ میں پڑھی جاتی ہے۔ اور جس کو نماز تہجد کہتے ہیں۔ اس نماز تہجد میں خصوصیت کے ساتھ وہ لوگ بڑے بڑے حصص قرآن شریف کے پڑھا کرتے تھے۔ بلکہ خود آنحضرت صلعم بھی نماز تہجد میں بہت قرآن شریف پڑھا کرتے یہاں تک کہ آپ کی نسبت بعض احادیث میں آیا ہے کہ بعض دفعہ ایک ہی رکعت میں قرآن شریف کے آٹھ نو پارے یعنی ۱/۳ حصہ قرآن شریف کے قریب آپ نے پڑھا تھا۔ اور صحابہ کی طرز زندگی یہی تھی کہ وہ آنحضرت صلعم کے عمل و فعل کو اپنے مسلک کے لئے نمونہ سمجھتے تھے۔ اور آپ ہی کے نمونہ پر چلتے تھے۔ اور اس لئے وہ بھی تہجد میں بہت قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ بعض صحابہ کے تہجد میں قرآن شریف پڑھنے کا جو ذکر آگیا ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ ایک صحابی کی نسبت لکھا ہے کہ انہوں نے ایک رکعت میں سورۃ البقرہ کو پڑھا اور یہ سورۃ قرآن شریف کا بارہواں حصہ یعنی اڑھائی پارے ہیں تہجد کی نماز کے متعلق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو تو یہ حکم تھا ہی کہ قم اللیل الا قلیلا نصفہ (الآیہ) یعنی نصف رات یا اس کے قریب قیام کیا کرو۔ اور اسی حکم الٰہی کی تعمیل میں آپ اس قدر کھڑے ہوا کرتے تھے۔ کہ صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے پاؤں بھی سوج جاتے تھے۔ مگر صحابہ کو بھی یہ حکم تھا کہ فاقرءوا ما تیسر منہ اور سارے معذوریت کے اسباب گن کر کہ خدا یہ بھی جانتا ہے کہ بعض تم میں سے بیمار ہونگے اور بعض جہاد کریں گے اور بعض سفر میں ہونگے پھر بھی حکم دیا کہ قرآن شریف تہجد میں پڑھا ضرور کرو۔ ہاں بیمار مسافر مجاہد کے لئے اجازت ہے کہ بہت نہیں تو تھوڑا ہی پڑھ لے۔ قرآن شریف میں اس تاکید کو پا کر صحابہ کہاں غافل رہ سکتے تھے۔ کثرت سے روایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا حصہ قرآن شریف کا رات کو تہجد میں پڑھا کرتے تھے۔ بلکہ بعض تو اس قدر مبالغہ اس میں کرتے تھے کہ آنحضرت کو یہ ہدایت دینی پڑی کہ اتنے وقت میں کم سے قرآن شریف ختم نہ کیا جائے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ نمونہ صرف تہجد ہی کی نمازوں تک محدود نہ تھا۔ بلکہ آپ جماعت کی نمازوں میں بھی بہت قرآن کریم پڑھا کرتے تھے چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے جماعت کراتے وقت پہلے

سورۃ النساء پڑھی۔ اور پھر اس کے بعد سورہ آل عمران پڑھی۔ یہ دونوں صورتیں قرآن شریف کا آٹھواں حصہ ہوتی ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جب کہ صرف ایک ہی نماز میں قرآن شریف کا اتنا بڑا حصہ پڑھا گیا تو کس قدر تکرار کا قرآن شریف کے پڑھے جانے میں ثبوت ملتا ہے بہت ساری حدیثیں اس بات کی گواہ ہیں کہ صبح کی نماز کی ایک رکعت میں سورۃ البقرہ جیسی لمبی سورتیں پڑھی جاتی تھیں شام کی نمازوں کے لئے اتنا وقت نہیں مل سکتا کہ لمبی سورتیں ان میں پڑھی جاسکیں۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سورۃ الطور جیسی سورتیں اُن میں بھی پڑھا کرتے تھے۔ اور یہ بھی لمبی سورۃ ہے جس میں پچاس کے قریب آیات ہیں۔ اسی طرح جب کبھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی کہیں نماز میں امامت کا موقعہ ملتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ پر وہ بھی عمل کرتے اور اُن کی طرح نمازوں میں لمبی لمبی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ کئی دفعہ اُن کی لمبی سورتیں پڑھنے کی شکایتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے عشا کی نماز میں سورۃ البقرہ تمام کی۔ مقتدیوں میں ایک شخص تھے جو دن کی محنت سے تھکے ماندے تھے اور وہ جلد آرام کرنے کے واسطے جانا چاہتے تھے ان کو اس لمبی قرات سے تکلیف ہوئی۔ اور اس پر انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی ایسا ہی یہ بھی ثابت ہے کہ وہ لوگ اپنی تنہائی کی نمازوں میں بھی لمبی سورتیں پڑھا کرتے تھے بلکہ اُن نمازوں میں تو جی کھول کھول کر وہ لوگ قرأت لمبی پڑھتے تھے۔ اب اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے۔ کہ وہ لوگ صرف قرآن شریف کو ایک دفعہ یاد ہی نہ کر لیا کرتے تھے بلکہ جتنا قرآن اُن کو یاد ہوتا تھا اس پر نمازوں میں اور نمازوں سے باہر اس کثرت سے تکرار کی مواظبت اور مداومت کرتے رہتے تھے کہ وہ ہمیشہ حافظہ میں تازہ رہتا تھا۔ اگر قرآن شریف کی ایک آیت بھی لکھی نہ جاتی تو حافظوں کے الواح قلب پر اس کے نقش ایسے کندہ تھے کہ ایک نقطہ بھی اس کا ضائع نہ ہونے پاتا۔ قرآن شریف نمازوں میں اور نمازوں سے باہر پڑھنے کی اس قدر کثرت سے آنحضرت صلعم اور صحابہؓ کی عادت تھی کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ بعض سورتیں بعض صحابہؓ نے نمازوں میں بار بار پڑھی جاتی سُن کر ہی یاد کر لی تھیں۔ کونسی الہامی کتاب دنیا میں ایسی ہے جس کی حفاظت کے لئے ایسے اسباب تو یہ پیدا ہوئے ہوں۔ تمام دنیا کی الہامی کتابوں میں نہ کسی کا ایسا دعوے ہے۔ اور نہ ہی کسی کے پاس حفاظت کے ایسے ثبوت ہیں۔

۴- آیتوں اور سورتوں کی ترتیب

ترتیب نزول اور ترتیب جمع

ہم نے پہلے دلائل قویہ یہ بات ثابت کردکھائی ہو کہ قرآن شریف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہی لکھا گیا اور آپ کی زندگی میں ہی قرّا اور حفاظ نے تمام وکمال حفظ کرلیا تھا۔ لیکن یہ مسلم بات ہے کہ اس مقدس اور مہیمن کتاب الٰہی کا نزول تدریج کے ساتھ ہوتا رہا اور تیئیس سال کے عرصہ میں پورا ہوا چنانچہ بعض سورتیں تو ایسی ہیں جو ایک ہی دفعہ اکٹھی نازل ہوئیں اور بہت سی اس قسم کی ہیں۔ کہ جن کا نزول تدریجی ہوا۔ اور بہت لمبے عرصہ میں پوری ہوئیں ایسا بھی ہوتا رہا کہ ابھی ایک سورہ مکمل نہ ہونے پاتی تھی کہ دوسری سورہ نازل ہونی شروع ہو جاتی۔ بعض وقت ایسا بھی ہوتا کہ دو مختلف سورتوں کی آیات ایک ہی وقت میں نازل ہو جائیں۔ غرض قرآن شریف ایک جلد اور ایک وقت میں اکٹھا نازل نہیں ہوا۔ بلکہ آیات اور سورتیں تئیس سال کے عرصہ میں تدریج کے ساتھ نازل ہوئیں۔ اور ترتیب نزولی ایسی نہ تھی کہ جس سے ہر ایک سورہ کی آیات علی التواتر نازل ہو کر اس کو پورا کرنے کے بعد دوسری سورت شروع ہوتی حسب اقتضائے منشائے الٰہی مختلف سورتوں کی آیات مختلف اوقات میں نازل ہوئیں۔ اور اس وقت جو قرآن شریف مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس میں ترتیب آیات ترتیب نزولی کے موافق نہیں بلکہ یہ وہ ترتیب ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی عین حیات بلکہ عین نزول آیات کے موقعہ پر بہ اشارہ وحی الٰہی سے کی تھی۔ اس موقعہ پر ایک معترض یہ سوال کرے گا کہ یہ ترتیب قرآنی جو نزولی ترتیب کے مطابق نہیں ہے کس نے کی تھی؟ کیا خود آنحضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی قرآن شریف کو اس طرح ترتیب دیا تھا یا کسی اور نے ترتیب دی تھی؟ پھر اگر قرآن شریف کی کوئی ترتیب حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائی تھی تو کیا یہ موجودہ ترتیب قرآنی وہی ترتیب ہے یا اس سے مختلف؟ ہر قسم کی اندرونی اور بیرونی شہادتیں اس بات کو قطعی طور پر ثابت کرتی ہیں کہ قرآن شریف کی سورتوں اور آیتوں کی موجودہ ترتیب سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی دوسرے کا کام نہ تھا بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی اپنے خیال کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ بلکہ آپ نے یہ ترتیب قرآنی وحی الٰہی کی ہدایت کے مطابق دی تھی اور موجودہ قرآن شریف بعینہ وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ترتیب دیا تھا۔ اگرچہ اس امر پر اندرونی شہادت موجود ہے مگر اس مضمون میں اس شہادت کیلئے گنجائش نہیں۔ اسلئے ہم صرف خارجی شہادت کو یہاں پیش کریں گے مگر اتنی بات ضرور کہیں گے کہ یہ محض ایک جھوٹا خیال ہو کہ قرآن شریف میں ترتیب نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ اس سے بہتر ترتیب قطعاً ناممکن ہے۔ ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ ربط و ضبط کلام کے لحاظ سے

ایسے اعجازی نظام سے رکھا ہوا ہے کہ ایک لفظ کا تغیر و تبدل بھی ممکن نہیں۔ وہ شخص جو اس نظام قرآنی پر کسی قسم کا حرف رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ بعض آیاتِ ماقبل و مابعد میں مضمون کا ربط نہیں یا کوئی مضمون چھوٹا ہوا ہے وہ صرف اپنی ناواقفیت سے ایسی بات منہ سے نکالنے کی جرأت کرتا ہے۔

قرآن کریم کی شہادت کہ ترتیب جمع قرآن وحی الٰہی سے ہوئی

خارجی شہادت اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ قرآنی آیتوں اور سورتوں کی موجودہ ترتیب نہ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور نہ زید نے کی تھی۔ بلکہ یہ وہی ترتیب ہے، جو آنحضرت صلعم نے وحی الٰہی کی ہدایت سے کی تھی۔ خود قرآن شریف بھی اس پر شاہد ہے۔ چنانچہ دیکھو سورہ القیامہ آیت ۱۹۔ ان علینا جمعه وقرانه فاذا قرأناه فاتبع قرانه یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن کا جمع کرنا اور اسکا تجھ کو (نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو) پڑھا دینا ہمارا کام ہے۔ پس جب ہم اسے پڑھ چکیں تو تم اسی کے پڑھنے کی پیروی کیا کرو۔ اس آیت کریمہ سے یہ بات پورے طور سے پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ جمع قرآنی شریف مع ترتیب آیات و سور صرف اللہ تعالیٰ کی وحی سے عمل میں آئی۔ قرآن شریف نہ صرف اسی بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ بلکہ یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ اس کا جمع کرنا اور اس کی ترتیب دینا سب امر الٰہی سے ہوا ہے۔ گویا یہ قرآن شریف جیسا کہ خدا کا کلام ہے۔ اسی طرح خدا ہی نے اس کو مرتّب اور جمع کیا۔ واضح رہے کہ اس آیت میں لفظ جمع جو وارد ہوا ہے۔ اس سے مراد ترتیب اور جمع دونوں ہیں۔ کیونکہ بغیر کسی خاص ترتیب کے جمع ممکن نہیں۔ جمع سے مراد ہی یہ ہے کہ ترتیب دیکر جمع کیا گیا۔ اور اس لفظ کے اس جگہ واقع ہونے سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ قرآن شریف اس ترتیب سے نازل نہیں ہوا تھا جس ترتیب سے وہ جمع کیا گیا یعنی اصل ترتیب قرآنی ترتیب نزولی سے مختلف ہے۔ کیونکہ اس آیت میں جمع اور نزول کو دو الگ الگ امر بتایا گیا ہے اگر ترتیب نزولی ہی وحی الٰہی کا منشا ہوتا تو جمع اور نزول کو الگ الگ بیان نہ کیا جاتا۔ کیونکہ پھر نزول کے ساتھ ساتھ ہی جمع کا کام بھی ہوتا جاتا۔ اور جمع کی کوئی الگ ضرورت نہ رہتی۔ مگر آیت موصوفہ میں اللہ تعالےٰ نے جمع کو ایک الگ فعل بیان فرمایا ہے اور پڑھنے یعنی نزول کو الگ۔ پس اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وحی الٰہی نے ترتیب جمع اور ترتیب نزول کو الگ الگ رکھا اور نزول اور جمع دونوں کو اپنے ذمہ لیا۔ پس جس طرح وحی الٰہی کا نزول آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سارا ہو چکا۔ اسی طرح اس کی جمع اور ترتیب کا کام بھی ضروری تھا۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی تکمیل کو پہنچ

جاتا اور ایسا ہی ہوا۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات قرآن شریف کی صاف صاف اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ترتیب قرآنی وحی الٰہی سے ہوئی جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے وقال الذین کفروا لولا نزل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ کذلک لنثبت بہ فؤادک ورتلنٰہ ترتیلاً (الفرقان آیت ۳۲) یعنی کافر کہتے ہیں کہ سارا قرآن مکمل اور مرتب ایک دفعہ نازل کیوں نہ کر دیا گیا۔ اُن کو کہہ دو کہ مصلحت الٰہی یہی ہے تاکہ کلام الٰہی کو جزواً جزواً نازل کرنے سے ہم تمہارے دل کو تسکین دیتے رہیں۔ اور ہم نے اسکو ٹھیر ٹھیر کر اتارا اور اس کی تالیف بھی نہایت عمدہ کی۔ ترتیل کے معنی میں تالیف بھی شامل ہے لسان العرب میں ہے رتل القرآن احسن تالیفہ وابانہ وتمہل فیہ یعنی ترتیب کو نہایت عمدہ کیا اور اسے کھول کھول کر اور ٹھیر ٹھیر کر بیان کیا۔ بلکہ سیاق وسباق عبارت خود بتا رہا ہے کہ یہاں ترتیب کا ذکر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تھوڑا تھوڑا نازل کرنے میں بہت سے مصالح الٰہی ہیں۔ اور یہ بھی کہ کلام الٰہی کے نزول سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل کو تسکین ہوتی ہے۔ اور یہ جو تم کہتے ہو کہ مرتب کیوں نہیں سو ترتیب وتالیف بھی ہم ہی کر رہے ہیں اور کریں گے۔ اور آخر پر اسی کو مکمل اور مرتب بنا دیں گے۔ ایسا ہی آیت وصلنا لہم القول سے بھی یہ پایا جاتا ہے کہ اجزائے قرآنی کی ترتیب کا کام بموجب دعویٰ قرآن کریم وحی الٰہی سے ہی ہوا۔

اب ہم حدیث صحیح کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا تاریخ یا حدیث صحیح سے یہ بات ثابت ہوتی ہے یا نہیں کہ موجودہ قرآن شریف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے اسی ترتیب الٰہی کے ساتھ جس کا ذکر آیات مذکورہ بالا میں ہے۔ ہمارے ہاتھوں تک محفوظ پہنچا ہے۔ اس امر کے لیے سب سے پہلے یہ بات دیکھنی ضروری ہے۔ کہ آیا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قرآن شریف اسی طرح جمع مرتب اور منتظم چھوڑا گیا یا نہیں۔ اس امر کے ثبوت میں صحیح روایات اور معتبر احادیث کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اور ہم پہلے آیتوں کی ترتیب اور پھر سورتوں کی ترتیب پر غور کریں گے۔ اور ہر ایک امر تحقیق طلب میں امور ذیل پر بحث کریں گے (۱) کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم نے قرآن شریف کو کوئی ترتیب دی ہوئی تھی؟ (۲) کیا قرآن شریف جس نہج سے نازل ہوا تھا اسی طرح اس کو ترتیب دیا گیا یا ترتیب جمع ترتیب نزول سے مختلف تھی۔ (۳) کیا موجودہ ترتیب قرآن شریف اس ترتیب سے مختلف ہے یا وہی ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو دی تھی۔

سوالات حل طلب

ولیم میور کا اعتراض اور اس کا جواب

یہ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمان نمازیں پڑھتے تھے اور نماز وں میں بڑا حصہ صرف قرآن شریف ہی کا پڑھا جاتا ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ نمازوں کے علاوہ بھی قرآن شریف کی تلاوت پر مداومت اس وقت سے ہی مسلمانوں میں مروج ہے۔ پھر جب کہ اتنی بڑی کتاب جس میں اتنے مختلف مضامین ہیں صحابہ رضی اللہ عنہم نے آنحضرت صلعم کی حیات میں حفظ کر لی تھی اور باقاعدہ طور پر نمازوں میں پڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو پڑھاتے اور سکھاتے تھے تو کس طرح ممکن ہے کہ یہ سارے کام بغیر جمع قرآن کے عمل میں لائے جا سکتے تھے۔ معترضین نے اس واضح حقیقت پر کبھی غور نہیں کیا۔ مثال کے طور پر ہم ذیل میں میور صاحب کی لائف آف محمد کے دیباچہ سے ایک جملہ نقل کرتے ہیں۔ "وہ بہر حال ہم یہ بات مان نہیں سکتے کہ اس زمانہ میں کامل قرآن شریف کسی معین ترتیب سے پڑھا جاتا تھا۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ موجودہ قرآن شریف کی نسبت مسلمانوں کا ایمان ہے کہ یہ اسی ترتیب کے موافق ہے جو آنحضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کی تھی۔ لیکن ہم اس کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر کسی معین ترتیب کا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) خود فیصلہ کر دیتے اور اس پر آپ عمل کرتے تو ضروری تھا کہ وہی ترتیب آئندہ محفوظ رکھی جاتی۔ مگر جو قرآن شریف ہمارے زمانہ تک محفوظ چلا آیا ہے وہ مضامین اور زمانہ کے لحاظ سے اپنے مختلف حصوں میں کسی معقول اور قابل فہم ترتیب کا تتبع نہیں۔ اور یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اس موجودہ ترتیب کے ساتھ اس کے پڑھنے کا حکم کرتے ہوں۔ ہمیں اس بات پر شبہ ہے کہ جتنی تعداد قرآنی سورتوں کی اس وقت موجود ہے۔ ان کی یہ تعداد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود مقرر کی تھی یا نہیں۔ بہر حال اتنا تو ضرور ہے کہ اکثر سورتوں کی اندرونی ترتیب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت سے نہیں" سر ولیم میور نے اس مضمون پر کچھ حاشیے لکھے ہیں۔ ان حواشی کے پڑھنے سے مصنف کے دل کا وہ اضطراب ظاہر ہو رہا ہے جو مذہبی تعصب اور تاریخ کے صحیح ثبوت کی موجودگی کے جھگڑے سے پیدا ہو رہا ہے۔ مثلاً جہاں اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں قرآن شریف کی معین ترتیب کے موجود ہونے سے انکار کیا ہے وہاں ساتھ ہی تسلیم کیا ہے کہ "یہ بات لکھی ہوئی موجود ہے کہ بعض صحابہ سارے قرآن شریف کی معین وقت میں تلاوت کر سکتے تھے۔ جس سے یہ بات قرار دینی پڑتی ہے کہ اس میں بعض حصص قرآنی کا باہمی تعلق اور ربط ضرور تھا۔" ایک اور حاشیہ میں اس نے یہ بات مانی ہے کہ "آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات میں چار پانچ تو ایسے صحابی موجود تھے جو کامل قرآن شریف کو نہایت صحت کے ساتھ از بر رکھتے تھے۔ اور اکثر ایسے موجود تھے جو قریباً سارا قرآن از بر رکھتے تھے۔" علاوہ ازیں جہاں اس نے سورتوں

کی تعداد کا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خود مقرر کرنے سے انکار کیا ہے۔ تو تردید کے خیال سے مفصلہ ذیل کا حاشیہ لکھ دیا ہے۔ "لیکن اس بات کو ماننے کے وجوہ ہیں۔ کہ بڑی بڑی سورتیں اور انکی آیات جو زیادہ تر مستعمل تھیں وہ معین ہو چکی تھیں۔ اور اپنے اپنے ناموں اور خاص نشانوں سے معروف اور موسوم تھیں۔ اور صحیح حدیثوں سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خود یوں بعض سورتوں کا موسوم اور معروف کرنا ثابت ہے مثلاً جب غزوہ حنین میں بعض لوگ بھاگ گئے تو اس وقت اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب بقرہ کر کے پکارا تھا۔" اور پھر حاشیہ میں ہی لکھتا ہے کہ "احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات میں اکثر صحابیوں نے قرآن شریف کی بعض سورتیں حفظ کر لی ہوئی تھیں۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے قرآن شریف کی ستر سورتیں سیکھی تھیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری مرض کے ایام میں ستر سورتیں تلاوت فرمائی تھیں۔ جن میں سات لمبی سورتیں تھیں۔ ان حدیثوں سے کم از کم قرآنی سورتوں میں ایک حد تک معین تقسیم ضرور ثابت ہوتی ہے۔ البتہ سورتوں کی ترتیب کا اس سے پتہ نہیں لگ سکتا۔" اور پھر لکھتا ہے۔ کہ "جبکہ یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سور تہائے قرآنی کا استعمال کیا کرتے تھے تو اس سے یہ بات صاف طور پر عیاں ہوتی ہے۔ کہ سورتوں کی ترتیب کا کسی حد تک آپ نے ضرور فیصلہ کر دیا ہوا تھا۔" اسی امر کے متعلق آگے چل کر ایک اور حاشیہ میں ولیم میور صاحب لکھتے ہیں کہ "حدیث مذکورہ بالا جس میں سورتوں کی وہ تعداد لکھی ہے جو بعض صحابہ کو یاد تھیں۔ اور نیز وہ تعداد جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری وقت میں پڑھی تھیں مذکور ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ سورتیں اس وقت مکمل اور مرتب صورت میں موجود تھیں۔"

ولیم میور صاحب کے دیباچہ کے متن اور مذکورہ بالا حواشی کو پڑھنے سے صاف پتہ ملتا ہے کہ اُن کے دلی بغض و تعصب نے مجبور کر کے وہ سطور لکھوا دیں جن میں متن میں انہوں نے انکار ترتیب کیا ہے لیکن تاریخ کی سچی شہادت نے ان حواشی کو اسی کے ذیل میں قلمبند کرنے پر اُسے مجبور کیا جن سے متن کی تردید ہوتی ہے۔ اگرچہ حواشی کے لکھنے میں میور صاحب نے تعصب کی وجہ سے بخل سے کام لیا ہے لیکن ان کا تضاد ایسا عیاں ہے کہ ہر ایک احتیاط اور غور سے پڑھنے والا اسے آسانی سے دیکھ سکتا ہے۔ اور مصنف کے دل کے اضطراب کی حالت سے ناواقف نہیں رہ سکتا۔ متن میں تو لکھا ہے۔ کہ قرآن شریف آیتوں اور سورتوں میں کوئی معین ترتیب اور ربط موجود نہیں تھی۔ اور حواشی میں تاریخی شہادت اس کے موجود ہونے کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے۔ متن میں لکھا ہے کہ نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورتوں کے نام ہی مقرر کئے اور نہ ہی اُن کی تعداد معین فرمائی۔ لیکن حاشیے میں صاف لکھا ہے کہ اس

بات کی تاریخی شہادت موجود ہے۔ کہ سورتوں کی تعیین وتقسیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی تھی اور اُن کی صورتوں کو بھی آپ نے معین فرما دیا تھا۔ بعض کلمات تعصب کی وجہ سے مصنف نے اُنکے ساتھ حاشیہ میں بڑھا دیئے ہیں۔ جیسے "بعض حصص" اور "کسی حدتک" وغیرہ۔ یہ غور کا مقام ہے کہ جبکہ حاشیہ میں صاف طور پر اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ قرآن شریف کی ستر سورتیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں مرتب اور منتظم موجود تھیں۔ جن میں وہ لکھتے ہیں کہ سات لمبی سورتیں بھی شامل تھیں تو پھر باقی کی چوالیس سورتوں کی نسبت جو نمازوں میں عام طور پر پڑھی جاتی تھیں کیونکر گمان ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت اس حالت میں موجود نہ تھیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود مصنف نے ان باقی چوالیس سورتوں میں ترتیب کے نہ ہونے کے متعلق کوئی شہادت پیش نہیں کی۔ پس اگر اور کوئی شہادت ترتیب دسور و آیات پر نہ بھی ہوتی تو ایک مخالف معترض کے اس بیان سے ہی یہ یقین کرنے کے لئے کافی وجوہات پیدا ہوتے ہیں کہ سورتیں اور آیات منتظم اور مرتب صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں موجود تھیں۔ اور پھر اسی نتیجہ کے موید اس مخالف مصنف کا یہ اقبال ہے کہ بعض صحابہ ایسے بھی موجود تھے جو نہ صرف بعض حصص کو صرف حافظہ سے دہرا سکتے تھے بلکہ کل کے کل قرآن شریف کو اسی طرح دہرا سکتے تھے اور اعلیٰ درجہ کی احتیاط وصحت کے ساتھ وہ یہ کر سکتے تھے۔

آیات کی ترتیب کی قطعی شہادت

یہ دعویٰ کہ ایک ایک آیت جب نازل ہوتی تھی تو اسے یونہی بلا ترتیب رہنے دیا جاتا تھا اور کوئی نہ جانتا تھا کہ کونسی آیت کس سورۃ کی ہے۔ اور کہاں رکھی جاویگی بدیہی طور پر ایک لغو دعویٰ ہے۔ اور کسی تردید کا محتاج نہیں۔ جب کہ یہ بات ثابت ہے کہ قرآن شریف حفظ کیا جاتا تھا اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کم وبیش کچھ نہ کچھ حصہ حفظ کرتے جاتے تھے تو اگر آیات کی ہی کوئی ترتیب نہ تھی تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ کوئی معین حصہ کوئی شخص حفظ کر لیتا کیا یہ قیاس میں آسکتا ہے کہ ہر ایک شخص بجائے خود ایک ترتیب دیکر قرآن شریف کو حفظ کرتا ہو۔ اور اس طرح جتنے صحابی حفظ کرنے والے ہوں اسی قدر مختلف ترتیبیں آیات کی مروج ہوں؟ پھر یہ بھی ثابت ہے کہ قرآن شریف لکھا بھی جاتا تھا۔ اور بعض سورتوں کے مکمل نسخوں کا عام طور پر استعمال میں ہونا بھی تاریخ صحیح سے ثابت ہے۔ پس ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ہر ایک نسخہ ایک جداگانہ ترتیب سے لکھا جاتا تھا؟ یہ کیسا پراز حماقت دعویٰ ہے کہ ایک ہی ترتیب سب صحابی ملحوظ نہیں رکھتے تھے کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ ہر ایک حفظ کرنے والا ایک الگ ترتیب کا پیرو ہو اور ہر ایک نسخہ جو لکھا جاتا ہو وہ جداگانہ ترتیب سے لکھا جاتا ہو اور نہ کوئی دو پڑھنے والے اور کوئی دو نسخے ایک ہی سورۃ کے باہم کسی ایک ترتیب پر متفق ہوں اور نہ ہی دو حافظ

اور تحریر کا باہم کسی ایک ترتیب پر اتفاق ہو۔ گویا ایک ایک سورۃ کی ہزارہا الگ الگ ترتیبیں موجود تھیں۔ پھر ہم پوچھتے ہیں کہ جب نمازوں میں قرآن شریف پڑھا جاتا تھا تو کیا ہر ایک پڑھنے والا ایک الگ ترتیب سے کوئی حصہ پڑھ دیا کرتا تھا؟ ایسی صورت میں کوئی مقتدی یہ کب کہہ سکتا تھا کہ اس نے کونسا حصہ قرآن شریف کا پڑھا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ایسی ضخیم کتاب جو اس طرح شب و روز عام مجمعوں میں اور گھروں کے اندر پڑھی جاتی تھی۔ وہ ایک ایسی بے ترتیب صورت میں تھی۔ کہ کسی فقرہ کے متعلق کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ کہاں کا فقرہ ہے۔ اور ہزارہا آدمی جو شب و روز اس کی تلاوت کرتے تھے وہ سب جس طرح کسی کا جی چاہا کوئی فقرہ آگے اور کوئی فقرہ پیچھے پڑھ دیتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہر ایک سورت کی آیات تو معین تھیں اور اس طرح صحابہؓ کو یہ علم تو دیا گیا تھا کہ فلاں سورت میں فلاں فلاں آیات ہیں۔ مگر ہر ایک سورہ کی آیات کی بجائے خود کوئی ترتیب نہیں تھی۔ تو یہ دعویٰ بھی اس دلیل سے مردود ثابت ہوتا ہے جس سے وہ پہلا دعویٰ کہ سارا قرآن شریف ایک بے ترتیبی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ غلط ثابت ہوتا ہے۔ ان دعاوی کی لغویت کو ثابت کرنے کے لئے اگر اور کوئی دلیل ہمارے ہاتھ میں نہ بھی ہوتی تو صرف یہی ایک دلیل جس کی بنا معتبر سے معتبر روایات پر ہے کافی تھی کہ قرآن شریف حفظ کیا جاتا تھا کیونکہ بغیر ایک ترتیب کی پیروی کے حفظ کرنا محال تھا۔ مثلاً اسی دعویٰ پر غور کرو کہ ہر ایک سورۃ میں آیات تو معین تھیں مگر اُن کی ترتیب معین نہ تھی۔ اب سو سو آیات کی بہت سی سورتیں موجود ہیں۔ پس اگر ان سو آیتوں میں کوئی ایک ترتیب نہ تھی۔ اور ہر ایک لکھنے والا اور ہر ایک پڑھنے والا ایک الگ ترتیب کی پیروی کرتا تھا۔ تو سو آیات کی جداگانہ ترتیبیں اسقدر تعداد تک پہنچتی ہیں کہ لاکھ آدمیوں میں سے کوئی دو بھی ایک ترتیب پر متفق نہ ہو سکتے تھے۔ اس صورت میں ہر ایک سورۃ گویا لاکھوں الگ الگ سورتیں تھیں۔ اور قرآن کریم بھی ایک نہ تھا بلکہ لاکھوں الگ الگ قرآن شریف تھے۔ ایک لمحہ کیلئے بھی اگر ایک شخص حق طلبی اور خدا ترسی کو دل میں لے کر غور کرے تو وہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ یہ بالکل محال تھا کہ بغیر ایک ترتیب کی پیروی کے قرآن شریف کی تعلیم اور تعلم کا سلسلہ جاری رہ سکتا۔ نہ ہی ہزارہا صحابیوں میں سے ایک دوسرے کی نسبت یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے کونسا حصہ یا کون سی سورۃ پڑھ رہا ہے۔ اور واقعی صحیح پڑھ رہا ہے یا غلط۔ علاوہ ازیں صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ جب ایک شخص کوئی سورۃ یا کوئی حصہ کسی سورہ کا پڑھتا اور اس سے کوئی غلطی ہو جاتی یا کوئی آیت درمیان سے رہ جاتی تو سننے والے معاً اس کی غلطی کو نکال دیتے۔ حالانکہ اگر ترتیب آیات کوئی نہ ہوتی تو یہ محال تھا کیونکہ کسی دوسرے کی نسبت کسی شخص کو کیا علم ہو سکتا تھا کہ وہ کس آیت کو پڑھتا ہے۔ ایسی صورت میں غلطی

کا نکالنا قطعاً ممکن نہ تھا۔

ترتیب آیات ترتیب نزولی سے جداگانہ تھی

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہوتی ہے۔ کہ قرآن شریف کی آیات میں ضرور کوئی خاص ترتیب ملحوظ رکھی جاتی تھی جس کے موافق لوگ اسے پڑھتے تھے اور حفظ کرتے تھے اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ ترتیب ترتیب نزولی کے موافق تھی یا اس سے الگ کوئی اور ترتیب تھی۔ اس کا جواب معتبر تاریخی شہادت سے ہمیں یہی ملتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ترتیب نزولی سے الگ ایک ترتیب آیات کو دیا کرتے تھے۔ نزول آیات کے لحاظ سے ایسا ہوتا کہ بعض وقت ایک سورت کے کسی حصے کے نزول کے بعد دوسری کسی سورہ کا حصہ نازل ہو جاتا پس ایسی حالت میں نزولی ترتیب ممکن نہ تھی۔ علاوہ ازیں صحیح روایات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جب کبھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورۃ میں فلاں جگہ رکھا جائے۔ جیسا کہ حضرت عثمان کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ عن عثمان بن عفان قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مما یاتی علیہ الزمان ینزل علیہ من السور ذوات العدد فکان اذا انزل علیہ الشئ یدعو بعض من یکتب عندہٗ فیقول ضعوا ھذا فی السورۃ التی یذکر فیھا کذا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا یہ ہمیشہ کا معمول تھا کہ جب کئی سورتوں کی آیتیں نازل ہوتیں۔ تو آپ صریح طور پر اس موقعہ کی ہدایت فرما دیا کرتے تھے جہاں کوئی آیت بلحاظ ترتیب رکھی جانی ضروری ہوتی۔ پس اس صریح اور بین شہادت سے بھی یہ ظاہر ہے کہ آیات کی ترتیب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تھی۔ ایسی شہادت کی موجودگی میں کوئی سمجھدار آدمی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ضرور آیات کو ترتیب دیتے تھے اور وہ ترتیب ترتیب نزولی سے جداگانہ تھی۔

موجودہ ترتیب آیات ترتیب نبوی ہے

اب دو باتیں حل ہو چکیں یعنی ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آیات قرآنی کو ترتیب دیتے تھے اور دوسری یہ کہ وہ ترتیب ترتیب نزولی سے الگ تھی۔ اس لئے اب صرف یہ تیسرا سوال حل کرنے کے قابل باقی ہے۔ کہ کیا وہ ترتیب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی اسی کے موافق موجودہ ترتیب آیات قرآنی کی ہے۔ یا یہ موجودہ ترتیب ترتیب نبوی سے الگ ہے۔ یہ امر تو مبین ہے کہ موجودہ ترتیب بھی ترتیب نزولی سے الگ ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ترتیب نزولی سے الگ ترتیب دی تھی پس اگر کوئی شہادت اس امر کی نہ پائی جائے کہ قرآن کریم کی تاریخ میں کسی وقت آیات کی ترتیب کو بدلا گیا تھا تو یہ نتیجہ قطعی اور یقینی ہوگا کہ موجودہ ترتیب بعینہٖ وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہم تاریخ قرآن کو دو زمانوں

پر تقسیم کرتے ہیں یعنی اول حضرت عثمانؓ سے پہلے۔ اور دویم حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ اور آپ کے بعد۔ اِن میں سے ایک زمانہ کے متعلق یعنی حضرت عثمانؓ کے زمانہ کے بعد جو زمانہ گذرا ہے اس کے متعلق اسلام کے کسی سخت سے سخت دشمن اور اندھے سے اندھے نکتہ چین نے بھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ جو ترتیب حضرت عثمان کے وقت میں اور آپ کے شایع کردہ صحیفوں میں موجود تھی اس میں آج تک ایک سر مو کا فرق بھی آیا ہے۔ پس اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ قرآن کریم کی ترتیب آج تک نہیں بدلی اور وہی ترتیب سورتوں اور آیتوں کی اس وقت قرآن کریم میں موجود ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں آپ کی ہدایت کے ماتحت دی گئی تھی۔ اب صرف یہ دکھانا باقی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لیکر حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک کسی موقعہ پر اصلی ترتیب کو تبدیل نہیں کیا گیا۔ اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ کے صحیفوں میں وہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں تھی۔ ایک موٹی سے موٹی سمجھ کا آدمی بھی اتنی بات آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ حضرت عثمان کو ترتیب بدلنے کے لئے کوئی چیز محرک نہ تھی۔ یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک خاص ترتیب قرآن شریف کی تلاوت میں ملحوظ رکھتے تھے اور اس ترتیب پر صحابہ نے قرآن شریف کو حفظ کیا۔ ہم اوپر دکھا چکے ہیں اور یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ یہ ترتیب ترتیب نزولی سے الگ تھی۔ اب جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت عثمان نے یا کسی اور شخص نے اس ترتیب کو جس پر صحابہ اور حفاظ قرآن کریم قایم ہو چکے تھے، تبدیل کر دیا تھا۔ یہ بار ثبوت اس پر ہے کہ وہ ایسی تبدیلی کی شہادت پیش کرے اور جب تک کوئی ایسی شہادت نہ ہو اس کا دعویٰ یقینی اور قطعی طور پر باطل ثابت ہو گا۔ مگر ہم جب حدیث صحیح کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ایک شمہ بھر بھی ایسی شہادت ہمیں نہیں ملتی۔ اور نہ ایسا یقین کرنے کے کوئی وجوہات پائے جاتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے وقت تک اتنا زمانہ نہیں گذرا تھا کہ سارے صحابہ کے بالمقابل ایک آدمی کو یہ جرات ہو سکتی کہ وہ اس ترتیب کو بدل دے جس پر سب قایم تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فوت ہوئے ابھی بارہ سال ہی گذرے تھے اور ہزارہا صحابہ اس وقت زندہ تھے۔ جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے قرآن شریف سنا ہوا تھا۔ اگر کوئی تبدیلی ترتیب میں اس وقت وقوع میں آتی تو ایسا واقعہ خاموشی سے نہ گذر سکتا تھا، بلکہ ایک ایسا شور برپا ہوتا جس کے ذکر سے تاریخ کے صفحوں کے صفحے بھر جاتے اور اول تو یہی بات سوچنے کی ہے کہ حضرت عثمانؓ کو غرض کیا تھی کہ وہ ترتیب بدلتے اور کونسی ضرورت پیش آئی تھی کہ ترتیب بدلی جاتی۔ نہ کوئی ضرورت پیش آئی نہ کوئی غرض کسی کو تھی نہ ہی اس امر کا کہ ترتیب بدل دی گئی تھی کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی ذکر پایا جاتا

ہے پس ایسا دعویٰ کہ حضرت عثمان نے ترتیب آیات کو بدل دیا تھا۔ سراسر حماقت اور لغویت سے پُر ہے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو صحیفے نقل کرائے وہ سارا اُن کا اپنا یا زید کا کام نہ تھا۔ بلکہ دیگر صحابی بھی اس میں شامل تھے اور وہ تمام صحابہ جو حفظ قرآن شریف میں خاص شہرت رکھتے تھے انہی کی زیر نگرانی حضرت عثمان رضؓ نے یہ کام کرایا تھا۔ اس کو بھی چھوڑو۔ ہم کہتے ہیں کہ کم از کم کوئی یہی دکھا دے کہ حضرت عثمانؓ پر اس وقت کسی نے یہ الزام دیا تھا کہ آپ نے قرآن شریف کی سورتوں یا آیتوں کی ترتیب بدل دی ہے۔ اگر کوئی الزام آپ پر دیا گیا وہ یہ تھا کہ آپ نے مسلمہ قرأت کے سوا بعض اور قرأتوں کو روکا۔ مگر اس کی اصلیت کیا تھی ہم آگے چل کر دکھائیں گے۔ بہر حال آیتوں کی ترتیب کے بدل دینے کی ایک ذرہ بھر بھی شہادت موجود نہیں۔ اور ایسی شہادت کی عدم موجودگی میں یہ ماننا پڑے گا کہ قرآن شریف کی ترتیب آیات وہی رہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں تھی۔

احادیث میں حوالے سے ترتیب کا ثبوت

ایک امر کے قطعی ثبوت کے لئے دو ہی قسم کی شہادت ہو سکتی ہے۔ اول یہ کہ اس کے خلاف کوئی شہادت موجود نہ ہو۔ دوسری یہ کہ اس کی تائید میں زبردست شہادت موجود ہو۔ قسم اول کی شہادت ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ دکھا چکے ہیں کہ قرآن کریم کی تاریخ میں کوئی وقت بھی ایسا نہیں آیا۔ کہ جس میں اس کی آیتوں کے موجودہ انتظام میں کوئی ذرہ بھر بھی تغیر و تبدل بھی واقع ہوا ہو۔ اس قسم کے ثبوت کے علاوہ کثرت سے دلایل بدیہیہ یقینیہ قسم ثانی کے بھی موجود ہیں۔ جو اور بھی وضاحت سے اس امر کو بپایہ ثبوت پہنچاتے ہیں۔ یہ وہ دلایل ہیں جو احادیث صحیحہ سے مستنبط ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت امام بخاری علیہ الرحمۃ نے باب فضل سورۃ البقر کے ضمن میں ایک حدیث نقل کی ہے عن ابی مسعود رضی اللہ عنہ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من قرا بالآیتین من اٰخر سورۃ البقرۃ فی لیلۃ کفتاہ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی رات میں سورۃ البقر کی آخری دو آیتیں پڑھے تو یہ اس کے لئے کافی ہیں"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر ایک سورت میں آیات کو ایک ترتیب دیتے تھے اور اسی ترتیب سے صحابہ کو قرآن شریف پڑھاتے تھے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کسی سورۃ کی آخری دو آیتوں کی طرف اشارہ نہ فرماتے۔ اور نہ ہی صحابہ آپ کے اس اشارہ کو سمجھ سکتے یہ حدیث اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ ہر ایک آیت قرآنی کے لئے ابتدا ہی سے ایک معین اور معروف مقام قرآن شریف میں تھا۔ اسی کی تائید میں ایک دوسری حدیث میں یوں آیا ہے۔ کہ سورہ بقرہ کی آیت اٰمن الرسول بما انزل الیہ من ربہٖ سے شروع ہو کر اخیر سورہ وانصرنا علی القوم الکفرین تک پڑھے۔ اور آج بھی انہی دو آیات کو

اس سورت کا خاتمہ ہوتا ہے جس سے یہ ثابت ہوا کہ وہی ترتیب جو آنحضرت صلعم نے آیات کو دی آج تک قرآن شریف میں چلی آتی ہے۔ گویا ایک ہی حدیث سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک یہ کہ شروع سے ہر سورۃ کی آیات کو ایک خاص ترتیب دی جاتی تھی دوسری یہ کہ وہی ترتیب آج تک قرآن کریم میں موجود ہے ایسا ہی ایک اور حدیث صحیح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانہ خروج دجال میں سورۃ الکہف کی پہلی دس آیتیں پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اور ایک حدیث میں آخری دس آیات کے پڑھنے کا حکم دیا ہے تو جب تک سورت کی آیات میں خاص ترتیب موجود نہ ہو پہلی یا پچھلی دس آیتوں کے الفاظ بے معنی ہوتے۔ صحیح بخاری میں ایک اور حدیث ہے جس میں ذکر ہے کہ حضرت ابن مسعود نے نماز میں سورہ انفال کی چالیس آیتیں پڑھیں۔ اور محدث عبدالرزاق نے دوسرے سلسلہ رواۃ سے اس کو یوں بیان کیا ہے کہ ونعم النصیر تک سورہ انفال کو پڑھا اور آج بھی چالیس آیتیں انہی الفاظ پر ختم ہوتی ہیں۔ اس سے بھی صاف معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم نے بھی ایک ترتیب آیتوں کو دی تھی اور وہی ترتیب آج بھی قرآن شریف میں موجود ہے۔ ایسا ہی ایک اور حدیث بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلعم تہجد کے وقت اٹھتے تو سورہ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھا کرتے تھے اور چونکہ وہی دس آیات مسلمان بھی آپ کے اتباع میں پڑھتے تھے جو درجہ بدرجہ ہم تک پہنچیں اور ہم انہی دس آیتوں کو آج بھی سورہ آل عمران کے آخر پر پاتے ہیں۔ یہ صرف چند ایک مثالیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ آیات کی ترتیب سورتوں میں نبی کریم صلعم کے زمانہ میں موجود تھی اور وہی ترتیب آج قرآن شریف میں ہے۔ ان کے ماسوا اور بھی بہت سی حدیثیں اس مضمون پر موجود ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس بات کا قطعی فیصلہ کرنے کے لئے اسی قدر کافی ہیں۔ ایک طرف کوئی روایت ایسی نہیں جس میں ترتیب کے بدلنے کا ذکر ہو۔ دوسری طرف ایسی روایات موجود ہیں جو بتاتی ہیں کہ ہر ایک آیت کا ایک خاص مقام تھا جہاں آنحضرت صلعم نے اسے خود رکھوایا تھا۔

حضرت علی کا نزولی کے مطابق ترتیب دینا

اس میں کچھ شک نہیں کہ ایک روایت میں یہ ذکر ہے کہ حضرت علی نے قرآن شریف کو ترتیب نزولی کے موافق جمع کیا تھا۔ لیکن اول تو یہ روایت ہی ماننے کے قابل نہیں کیونکہ آیات کی ترتیب نزولی ناممکن تھی۔ ایک ایک وقت میں کئی کئی سورتیں اکٹھی نازل ہوتی تھیں اور کبھی ایک سورت کی کچھ آیتیں نازل ہوتی تھیں تو کبھی دوسری کی۔ پس سورتوں کے تقسیم معین ہونے کی وجہ سے یہ ناممکن تھا کہ آیات کی ترتیب نزولی پر قرآن شریف جمع ہو سکتا۔ اب باقی صرف ایک صورت رہ جاتی ہے کہ حضرت علی نے سورتوں کی کوئی ترتیب نزولی قرار دی ہو۔ سو وہ بھی درست نہیں ہو سکتا اس لئے

کہ ایک سورۃ کا حصہ مثلاً اگر ایک وقت نازل ہوتا ہے تو کچھ حصہ بہت وقت بعد نازل ہوتا ہے۔ اور اس درمیان میں کئی اور سورتیں نازل ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس بات کو اگر مان بھی لیا جائے کہ حضرت علی نے سورتوں کی کوئی علیحدہ ترتیب دی تھی تو یہ محض تاریخی رنگ کی ایک شہادت تھی کہ کس سورت کا بیشتر حصہ کس زمانہ میں نازل ہوا۔ حضرت علی کا اس نزولی ترتیب کو کبھی مشتہر کرنے کا منشا نہ تھا اور نہ ہی اُن کا یہ منشا تھا کہ اس ترتیب سے قرآن شریف کی تلاوت کی جاوے۔ اُن کا منشا صرف اس قدر ہوگا کہ ایک تاریخی شہادت نزول کی موجود رہے۔ ہاں اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی تیسری ترتیب بھی موجود ہوتی تو ضرور تھا کہ اس کا ذکر بھی کہیں نہ کہیں کسی پیرایہ میں موجود ہوتا۔ حضرت علی نعوذ باللہ اسے ترتیب نبوی کے مقابل پر جاری کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت عثمان کا زمانہ آیا اور یہ تجویز کیا گیا۔ کہ قرآن شریف کے نسخے خاص نگرانی کے ساتھ لکھ کر لوگوں میں تقسیم کئے جائیں۔ اور اس کام کا اہتمام ایک منتخب مجلس کے سپرد کیا گیا تو ان مہتمموں کی مجلس کے اراکین عظام میں حضرت علی بھی تھے۔ انہوں نے اس وقت اس ترتیب کا ذکر بھی نہیں کیا۔ جو انہوں نے وحی الٰہی کی تاریخ محفوظ کرنے کے لئے کی تھی۔ اور نہ ہی کسی اور ترتیب کا سوائے اس موجودہ ترتیب کے کوئی تذکرہ کیا۔ اگر حضرت علی کے خیال میں کوئی اور ترتیب ہوتی تو یہ بات اُن کی شان سے بعید تھی کہ وہ خاموشی سے اسی ترتیب موجودہ سے قرآن شریف لکھتے اور لکھواتے اور اسکو عام طور پر مسلمانوں میں رواج دینے کی کوشش کرتے۔ کم سے کم وہ اس مجلس میں شریک ہونے سے انکار کر دیتے۔ برخلاف اس کے جس ترتیب پر تمام جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم کا اتفاق اور عمل تھا۔ جو موجودہ ترتیب قرآن کریم کی ہے اسی کے مؤید اور معاون حضرت علی بھی تھے۔ ہاں قرآن شریف کے نزول کی ترتیب کو بغرض حفظ تاریخ اگر انہوں نے محفوظ کر لیا ہو تو اس میں کچھ ہرج بھی نہیں۔ سوال تو صرف یہ ہے کہ آیا انہوں نے اس ترتیب کو ترتیب قرآنی کے نام سے موسوم کر کے عام طور پر مروج کرنے کی کوشش یا ارادہ بھی کبھی کیا؟ پھر انہوں نے صرف حضرت عثمان کے زمانہ میں ہی ترتیب نبوی پر عمل پیرا ہونے اور اس کے رواج دینے میں مدد نہیں کی بلکہ جب اپنی خلافت کا زمانہ آیا تو بھی اسی ترتیب کو قایم رکھا۔ حالانکہ اگر قرآن شریف کی مسلمہ و مروجہ ترتیب میں ان کو کوئی اختلاف ہوتا تو فوراً سب سے پہلے اس کی اصلاح کرنا اُن کا فرض تھا۔ پس اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے تو صرف اسقدر کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے طور پر تاریخ نزول کو کسی قدر محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ باوجودیکہ بعض صحابہ کو دوسروں سے کئی مسایل میں اختلاف بھی تھا لیکن ترتیب آیات قرآنی کے متعلق صحابہ میں قطعاً کوئی اختلاف نظر نہیں آتا۔

تلاوت وحفظ قرآن بغیر ترتیب سور ناممکن تھا

اس کے بعد دوسرا مسئلہ جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ سورتوں کی ترتیب ہے اس مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ سوائے اس حال کے جب کہ سارے قرآن شریف کی تلاوت کرنا منظور ہوتا۔ نمازوں میں یا نمازوں کے باہر قرآن کریم پڑھنے کے لئے یہ امر ضروری نہیں خیال کیا جاتا تھا کہ سورتوں کی ترتیب کو ملحوظ رکھا جائے۔ یعنی اگر ایک رکعت میں ایک سورت پڑھی ہے تو دوسری میں اس سے اگلی سورت پڑھی جائے۔ ہم نے اوپر احادیث کی سند سے ثابت کیا ہے کہ صحابہ میں بہت سارے ایسے بزرگ موجود تھے جن کو سارا قرآن شریف ازبر تھا۔ اور وہ لوگ اسی اپنے حافظوں میں تروتازہ اور ضبط رکھنے کے لئے ہمیشہ تلاوت کرتے رہتے اور مقررہ مدت میں ختم کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس پر صحیح بخاری میں ایک باب باندھا ہے جس کا عنوان یہ ہے "کہ کتنی مدت میں قرآن شریف ختم کرنا چاہئے" اس باب کے ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں دی ہیں جن میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو تین دن سے کم عرصہ میں قرآن شریف کا ختم کرنا منع فرمایا تھا۔ اور ایک دوسرے صحابی کو سات دنوں سے کم عرصہ میں قرآن شریف کا ختم کرنا منع کیا۔ ان حدیثوں سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل ظاہر ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو سارا قرآن شریف حفظ تھا وہ ہمیشہ اس کی تلاوت کرتے رہتے تھے۔ اور معمولاً سات دنوں میں ختم کیا کرتے تھے۔ قرآن شریف جتنی بڑی کتاب حافظہ میں جب ہی محفوظ رہ سکتی تھی کہ اس کی تلاوت پر مداومت کی جائے۔ چنانچہ خود سرور کائنات صلعم نے فرمایا کہ قرآن شریف کو یاد رکھنے کے لئے اس کی ہمیشہ تلاوت کرتے رہنا چاہئے ورنہ یہ یاد نہیں رہے گا۔ اس لئے بھی صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن شریف کی تلاوت پر مداومت کرتے تھے۔ اب اس بات کا سمجھنا بہت آسان ہے کہ قرآن شریف کو بار بار پڑھنا اور ہر دفعہ ایک معینہ مدت کے اندر ختم کر اس امر کا متقاضی ہے کہ اس کی سورتوں کی کوئی ترتیب اور تقسیم موجود ہو۔ ورنہ مداومت کے ساتھ پڑھنا اور ختم کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ صریح شہادت بھی موجود ہے کہ سورتوں میں ایک ترتیب مقرر تھی۔ احمد۔ ابوداؤد وغیرہم نے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ سورتوں کی تقسیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائی تھی۔ ہم اس جگہ اس حدیث کو نقل کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے عن اوس بن ابی اوس حذیفة الثقفی قال کنت فی الوفد الذین اسلموا من ثقیف فقال لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طرأ علی حزبی من القرآن فاردت ان لا اخرج حتی اقضیه قال فسألنا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قلنا کیف تحزبون القرآن قالوا نحزبه ثلاث سور وخمس سور وسبع سور وتسع سور واحدی عشرة

وثلاث عشرۃ وحزب المفصل من ق حتی تختم" اوس فرماتے ہیں کہ ثقیف کے اس وفد میں جو اسلام قبول کرنے والے تھے میں بھی موجود تھا۔ آنحضرت صلعم نے ہمیں کہا کہ میں نے اپنی قرآن شریف کی منزل کو پورا کرنا ہے۔ اس لئے میں ارادہ کرتا ہوں کہ جب تک ختم نہ کرلوں اس وقت تک باہر نہ نکلوں۔ اس پر ہم نے اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کس طرح قرآن شریف کو حصوں میں تقسیم کیا ہوا ہے انہوں نے جواب دیا کہ تین سورتوں اور پانچ سورتوں اور سات سورتوں اور نو سورتوں اور گیارہ سورتوں اور تیرہ سورتوں اور ق سے شروع ہوکر اخیر قرآن تک جس کو مفصل کہتے ہیں" پس یہ سات حصے ہوئے جنہیں سات منزلیں کہا جاتا ہے۔ یہ ہر منزل ایک دن میں پڑھی جاتی ہے۔ اور اس طریق سے سارا قرآن شریف سات دنوں میں ختم ہوتا ہے۔ دوسری معتبر صحیح حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو تاکید فرمائی کہ قرآن شریف کو سات دنوں میں ختم کیا کریں اس حدیث کے راوی پہلی حدیث کے راویوں سے جدا ہیں۔ ان دونوں مضمون واحد کی حدیثوں کا مختلف راویوں کی روایت سے بیان ہونا ایک دوسرے کی صداقت پر دلیل ہے

قرآن شریف کی سات منزلوں سے ترتیب سور پر دلیل

مذکورہ بالا حدیث سے سورتوں کی ترتیب کا وجود واضح طور پر ثابت ہے کیونکہ وہی منزلیں جن میں قرآن شریف کے اس حدیث کی رو سے حصے کئے ہوئے ہیں۔ آج تک مسلمانوں میں مروج ہیں۔ اور ساری اسلامی دنیا اسی پر کاربند اور عامل ہے۔ پس اس تعامل سے بھی صاف شہادت اس حدیث کی صداقت کی ملتی ہے۔ ان سات حصوں کو مسلمانوں کی اصطلاح میں سات منزلیں کہتے ہیں۔ اور ہر ایک منزل میں اسی قدر سورتیں ہیں جو اس حدیث میں مذکور ہیں۔ جیسے کہ حدیث شریف میں لکھا ہے۔ ساتویں منزل ٹھیک اس کے مطابق سورہ ق سے شروع ہوتی ہے۔ پہلی چھ منزلوں میں کل اڑتالیس سورتیں ہیں اور یہی وہ تعداد ہے جو احادیث سے ثابت ہے۔ اس جگہ ایک بات ناظرین کو یاد رکھنی چاہیئے کہ حدیث مذکورۃ الصدر میں سورہ فاتحہ جو قرآن شریف میں سب سے پہلے لکھی ہوئی ہے شمار نہیں کی گئی اور یہ امر کسی غلطی پر مبنی نہ تھا۔ پس سورہ بقرہ سے شروع کرکے تین سورتوں کی ایک منزل۔ پھر اس کے بعد کی پانچ سورتوں کی دوسری منزل۔ پھر اس کے بعد کی سات سورتوں کی تیسری منزل۔ پھر اسکے بعد کی نو سورتوں کی چوتھی منزل پھر اس کے بعد کی گیارہ سورتوں کی پانچویں منزل پھر اس کے بعد کی تیرہ سورتوں کی چھٹی منزل اور ق سے (جو انچاسویں سورۃ ہے) شروع ہوکر اخیر تک ساتویں منزل ہوئی۔ اگر فاتحہ کو شامل کرکے شمار کیا جائے تو اس حساب سے سورہ ق پچاسویں سورۃ ہوتی ہے۔ اور اگر اس کو شامل نہ کیا جاوے تو پھر سورہ ق انچاسویں سورۃ ہوتی ہے اور اس

حدیث میں موخرالذکر حساب کو مخوظ رکھا گیا ہے۔ یعنی پہلی چھ منزلوں میں اڑتالیس سورتیں اور پھر انچاسویں سورہ ق سے ساتویں منزل شروع ہوتی ہے۔ جس طرح ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں کہ آیات قرآنی کی ترتیب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی اسی طرح اس حدیث سے ثابت ہے۔ کہ قرآن کریم کی سورتوں کی ترتیب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کی تھی۔ اور آج تک اسی ترتیب پر مسلمان قایم ہیں یعنی موجودہ ترتیب جو مسلمانوں میں مروج اور جاری ہے۔ وہ بجنسہٖ اور بلاتفاوت وہی ترتیب ہے جس میں ایک سرِمُو بھی فرق نہیں آیا +

ممکن ہے کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب کہ قرآن شریف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات تک پورے طور پر نازل نہیں ہو چکا تھا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ تک آیتیں اور سورتیں نازل ہوتی رہی تھیں تو پھر کسی ترتیب کا وجود کیونکر ممکن ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جب تک مورد وحی (صلی اللہ علیہ وسلم) زندہ رہے اُس وقت تک قرآن شریف کا نزول کمل نہیں سمجھا جا سکتا۔ لیکن اس بات سے آیتوں اور سورتوں کی ترتیب میں کوئی ہرج واقعہ نہیں ہوتا۔ جتنا حصہ قرآن شریف کا نازل ہو چکتا تھا۔ اس کو بھی قرآن ہی کہا جاتا تھا۔ اور لفظ قرآن کے معنوں میں یہ بات آسکتی ہے۔ لیکن اس حدیث میں بنی ثقیف کے اسلام لانے کا حال درج ہے۔ اور یہ ثابت ہے کہ ثقیف ہجری کے نویں سال میں مسلمان ہوئے تھے۔ اور اسی سال میں سورہ توبہ نازل ہوئی تھی۔ جو تاریخی سلسلہ نزول میں سب سے اخیر سورۃ تھی۔ پس جس زمانہ کا ذکر اس حدیث میں ہے اس زمانہ میں قریباً سارا قرآن شریف نازل ہو چکا تھا۔ اور جو آیات بعد میں نازل ہوئیں وہ اپنے موقعہ کی سورتوں میں داخل ہو گئیں۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ ایک چھوٹی سی سورۃ جس کا نام سورۃ النصر ہے۔ اس کے بعد نازل ہوئی۔ جو آخری منزل میں شامل ہے۔ اور اس حدیث میں صرف چھ پہلی منزلوں کی سورتوں کی تعداد بیان کی گئی ہے۔ لیکن آخری منزل کی سورتوں کی تعداد نہیں بیان کی۔ اس کی نسبت صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ ق سے شروع ہو کر خاتمہ تک ساتویں منزل ہے۔ پس اس سورہ کے نزول اور ساتویں منزل میں شمول سے اس شمار میں ہرگز کوئی فرق نہیں آیا جو پہلی چھ منزلوں کے متعلق بیان ہوا ہے۔

حضرت عائشہ کی شہادت کہ ترتیب نزولی اصلی ترتیب قرآنی نہیں

اس بات کی بھی کوئی شہادت موجود نہیں کہ سورتوں کی ترتیب کو آنحضرت صلعم کے بعد حضرت ابوبکر یا عثمان رضی اللہ عنہما نے کسی طرح تبدیل کر دیا ہو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے برخلاف تو کبھی کسی نے کوئی اعتراض اس قسم کا نہیں کیا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اُن کے نقش قدم پہ چلے۔ حضرت عثمان رضی

اللہ عنہ کے زمانہ میں جو نقلیں قرآن شریف کی کی گئی تھیں۔ وہ ان بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم کی نگرانی اور اہتمام میں تیار کرائی گئی تھیں جن کو علم قرآن میں زیادہ ماہر اور واقف مانا گیا تھا۔ اور اکثر اُن میں ایسے بزرگ تھے جن کو قرآن شریف ازبر تھا۔ علاوہ ازیں جو دلایل ہم نے اوپر قرآنی آیات کی ترتیب کے متعلق پیش کی ہیں۔ وہی دلایل مناسب تغیر کے ساتھ قرآن شریف کی سورتوں کی ترتیب پر حاوی ہوتی ہیں لیکن چونکہ بعض حدیثوں میں سورتوں کی ترتیب میں کچھ اختلاف کا ذکر بھی ہے۔ اس لئے اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن احادیث پر بھی نظر ڈالی جائے اس بارہ میں سب سے پہلے صحیح بخاری کے باب تالیف القرآن کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔ اس باب میں جو احادیث درج ہیں اُن میں سب سے پہلی حدیث یوں ہے۔ عن یوسف بن ماهك قال انی عند عائشۃ ام المومنین رضی الله عنها اذ جاءها عراقی فقال ای الکفن خیر۔ قالت ویحك وما یضرك۔ قال یا ام المومنین اریني مصحفك قالت لم قال لعلی اولف القران علیه فانه یقرأ غیر مؤلف قالت وما یضرك ایة قرات قبل انما نزل اول ما نزل منه سورة من المفصل فیها ذکر الجنة و النار حتی اذا ثاب الناس الی الاسلام نزل الحلال والحرام ولو نزل اول شئ لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابدا ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابدًا لقد نزل بمکة علی محمد صلی الله علیه وسلم وانی لجاریة العب بل الساعة موعدهم والساعة ادهٰی وامر وما نزلت سورة البقرة والنساء الا وانا عنده قال فاخرجت له المصحف فاملت علیه ای السور یوسف بن ماہک سے روایت ہے کہ میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا جب ایک عراق کا رہنے والا اُن کے پاس آیا۔ اور کہا کونسا کفن بہتر ہے۔ فرمایا تجھے دکسی خاص کفن، سے کیا تکلیف ہوتی ہے۔ کہا اے ام المومنین مجھے اپنا قرآن شریف دکھائیے۔ فرمایا کیوں کہا تاکہ میں اس پر قرآن کی ترتیب کروں وہ بلا ترتیب پڑھا جاتا ہے۔ فرمایا تجھے اس سے کیا نقصان پہنچتا ہے کہ کونسا حصہ پہلے پڑھا جاتا ہے۔ اس کا جو حصہ پہلے نازل ہوا تھا وہ مفصل سورتوں میں سے ایک سورۃ تھی جس میں بہشت اور دوزخ کا مذکور تھا۔ لیکن جب اسلام کا چرچا بڑھا اور لوگ داخل ہونے شروع ہوئے تو پھر جواز اور ممانعت کے احکام نازل ہونے لگے۔ اگر سب سے پہلے یہی حکم نازل ہوتا کہ شراب مت پیو تو لوگ کہتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اور اگر سب سے پہلے یہ نازل ہوتا کہ زنا مت کرو تو وہ کہتے ہم زنا کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ مکہ میں محمد صلعم پر نازل ہوا اور اس وقت میں ایک لڑکی تھی جو کھیلا کرتی تھی۔ بل الساعۃ موعدہم (القمر) اور سورہ بقرہ اور نساء نازل نہیں ہوئیں مگر میں آپ کے

کے گھر میں تھی۔ پھر آپ اپنا مُصحف نکال لائیں اور اس پر سورتوں کی آیتیں پڑھیں۔ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ ترتیب قرآن کے متعلق ایک عراقی نے حضرت عائشہ کے سامنے اپنا اعتراض پیش کیا۔ یہ شخص صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت میں سے نہ تھا بلکہ ایک نومسلم تھا جسے ابھی قرآن شریف سے چنداں واقفیت بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اسی حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جواب بھی درج ہے عراقی کی یہ بات کہ قرآن شریف کی کوئی ترتیب تلاوت میں ملحوظ نہیں رکھی جاتی محض ایک بیہودہ بات تھی اور اس کی نادانی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اسی لئے حضرت عائشہ اسے ملامت کرنے پر مجبور ہوئیں پھر اُسے اس بات کی ضرورت کو سمجھایا۔ کہ کیوں ترتیب نزولی کے مطابق قرآن شریف نہیں لکھا گیا بلکہ اس سے مختلف ترتیب رکھی گئی۔ حضرت عائشہ کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل نے یہ سوال کیا تھا کہ کیوں قرآن شریف نزولی ترتیب کے مطابق نہیں لکھا جاتا۔ کیونکہ حضرت عائشہ نے اس کے سوال کا جواب یہ دیا کہ اس میں کوئی ہرج کی بات نہیں کہ کوئی آیت جو پہلے نازل ہو چکی ہو کسی مابعد کی آیت کے پیچھے رکھی جائے۔ جو جلد قرآن شریف کی حضرت عائشہ نے اُس عراقی کو دکھلائی تھی اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب نزولی ترتیب سے مختلف تھی۔ اور یہ بات اس امر سے بھی زیادہ واضح ہوتی ہے کہ اپنی بات کی تائید میں حضرت عائشہ نے کئی سورتوں میں سے مختلف آیتیں اُس کو پڑھ کر سنائیں۔ اور وہ حضرت عائشہ کے قرآن شریف کو دوسرے قرآنوں کے موافق پا کر چلا گیا۔

نمازوں میں ترتیب سور ملحوظ نہ رکھی جاتی تھی

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ قرآن شریف کی سورتوں کی ترتیب جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے صرف سارے قرآن کی تلاوت کے موقع پر ملحوظ رکھی جاتی تھی۔ اور نمازوں میں قرآن شریف پڑھنے کے وقت یا نمازوں کے باہر جب تھوڑا تھوڑا حصہ پڑھنا منظور ہوتا تھا تو اس وقت اس ترتیب کے ملحوظ رکھنے کی چنداں ضرورت نہ سمجھی جاتی تھی۔ مثلاً نمازوں میں اس ترتیب کی نگہداشت کی ضرورت نہیں۔ اگر پہلی رکعت میں کوئی سورۃ یا کسی سورۃ کا کوئی حصہ پڑھا جائے۔ تو دوسری رکعت میں اسی حصہ سے آگے کا حصہ مسلسل طور پر پڑھا جائے۔ بلکہ جہاں کہیں سے جس سورۃ یا سورۃ کے حصہ کو چاہے پڑھ لے حدیثوں میں اس کی شہادت موجود ہے۔ اسی طرح دو یا دو سے زیادہ سورتیں کسی ایک رکعت میں پڑھ لی جاتی تھیں۔ اور بعض حالات میں نمازوں میں پڑھنے کے لئے ایسی سورتوں کو جمع کر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز میں عموماً بیس سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ جن میں سے اٹھارہ تو آخری منزل قرآن کی چھوٹی چھوٹی سورتیں تھیں جن کو مفصل کہتے ہیں۔ یہ مفصل سورتیں سورہ ق سے شروع ہوتی ہیں اور دو سورتیں حٰمٓ سے شروع ہوتی ہیں۔ یعنی تہجد کی دس رکعتوں میں یہ بیس سورتیں اس طرح پڑھا کرتے

تھے کہ ہر رکعت میں دو دو سورتیں پڑھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص تالیف فرمائی تھی جو حضرت ابن مسعود کے ذریعہ ہم تک محفوظ ہو کر پہنچی ہے۔ اور جس کو تالیف ابن مسعود کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تالیف کو قرآن شریف کی سورتوں کی ترتیب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اور نہ ہی اس پر ہمیشہ عملدرآمد کیا جاتا تھا۔ ابن مسعود کہتے ہیں کہ اس ترتیب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد کی نماز میں ایک یا ایک سے زیادہ مرتبہ ان سورتوں کو پڑھا۔ اور چونکہ صحیح حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نمازوں میں قرآن شریف کی معمولی ترتیب کو ملحوظ نہ رکھا کرتے تھے۔ تو اس خاص تالیف سے اصل ترتیب قرآنی کی قدر و منزلت میں کچھ بھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کا ذکر ہی اس لئے کیا گیا کہ یہ اصل ترتیب سے علیحدہ تھی نہ صرف تہجد کی نمازوں تک ہی یہ بات محدود تھی۔ بلکہ عام نماز میں بھی سورتوں کی ترتیب معمولہ کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ جیسے مثلاً ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے قرآن شریف کی چوتھی سورہ یعنی سورۃ النسا پہلی رکعت میں پڑھی اور دوسری رکعت میں تیسری سورۃ یعنی آل عمران پڑھی۔ اس واقعہ کے درج کتب ہونے کی بھی یہی وجہ ہے کہ اصل ترتیب سے اختلاف کی مثال محفوظ رہے اس کی اور مثالیں بھی ہیں۔

تالیف ابن مسعود

ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ تالیف ابن مسعود کی بیس سورتیں جنہیں مفصل کہا جاتا ہے کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز میں پڑھا کرتے تھے۔ اس بات کو دیکھ کر بعض لوگوں نے بے سمجھی سے یہ خیال کر لیا ہے کہ گویا حضرت ابن مسعود کے پاس جو نسخہ قرآن شریف کا تھا اس میں سورتوں کی ترتیب دوسرے نسخوں سے مختلف تھی۔ اس بات کی تائید میں صرف یہی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے اور جس میں بیس چھوٹی چھوٹی سورتوں کے نماز تہجد میں پڑھے جانے کی تائید کا ذکر ہے لیکن جب ہمیں اس بات کا ثبوت صاف صاف ملتا ہے کہ سورتوں کی ترتیب مروجہ کا لحاظ نمازوں میں ضروری نہیں سمجھا گیا تھا تو اس شہادت کا کچھ اثر اصل ترتیب قرآنی پر نہیں پڑتا۔ اور اگر فرض محال کے طور پر اس بات کو مان بھی لیں کہ حضرت ابن مسعود نے کسی اور ترتیب کے مطابق اپنا قرآن شریف لکھا ہوا تھا تو اس سے یہ بات نہیں پائی جاتی کہ وہ ترتیب صحیح تھی۔ اور جو قرآن شریف عام طور پر مسلمانوں میں مروج تھے۔ اُن میں غلط ترتیب سے سورتیں لکھی ہوئی تھیں۔ اگر ابن مسعود کی کوئی جدا ترتیب تھی تو وہ انہیں تک محدود رہی۔ کسی صحابی نے اس کی طرف کبھی التفات بھی نہیں کیا۔ بلکہ سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت نے اسی بات پر اتفاق کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے جو نسخے قرآن کریم کے لکھوائے جو حضرت ابو بکر کے وقت میں جمع کئے ہوئے صحیفے سے نقل کئے گئے تھے وہ اس ترتیب کے مطابق ہیں۔ جو آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے کی تھی اور اصل میں تو اس قضیہ کا فیصلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر ہونا تھا۔ نہ کہ شخصی آرا پر۔ اب اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ مذکورہ بالا تالیف ابن مسعود سے علاوہ حضرت ابن مسعود نے قرآن شریف کی باقی سورتوں کو کسی اور طریق سے ترتیب دیا تھا اور ان چند سورتوں میں بھی انہوں نے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تہجد کی نمازوں میں پڑھتے سن کر خیال کر لیا کہ یہی صحیح ترتیب ہے مگر یہ خیال اُن کا غلط تھا نہ تو یہ ہی ثابت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کو تحقیق ہی کیا اور نہ کسی اور صحابی سے ہی پُوچھا۔ صرف اپنے خیال سے ایک بات کا یکطرفہ فیصلہ کر لیا۔ اور اسی لئے اُن کے نام سے ہی یہ تالیف منسوب ہے۔ لیکن اس قیاس میں انہوں نے غلطی کھائی ہے۔ صحیح احادیث موجود ہیں۔ جن میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت میں کسی سورۃ کا کوئی حصہ پڑھ لیا کرتے تھے۔ اور پھر اس کے بعد دوسری رکعت میں کسی اور سورۃ کا کوئی اور حصہ پڑھ لیتے تھے خواہ وہ ترتیب قرآنی میں اس سے پہلے ہی آئی ہو۔ ابن مسعود نے کسی ایسی ترتیب پر ایک جدا تالیف کی بنا رکھدی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض وقت کی نمازوں میں ظاہر ہوئی انہوں نے اپنے فیصلہ کی اس کو بنا ٹھیرانے میں سخت غلطی کھائی۔ لیکن عام اصولی لحاظ سے ان کی ترتیب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآن کی ترتیب سے کچھ چنداں مختلف نہ تھی۔ جیسے حضرت عثمان کے قرآن میں طوال یعنی لمبی سورتیں ابتدا میں لکھی ہوئی تھیں اسی طرح انہوں نے بھی اُن کو پہلے ہی لکھا ہوا تھا۔ البتہ اتنا فرق بتایا جاتا ہے۔ کہ انہوں نے سورۃ النسا کو سورہ آل عمران سے پہلے رکھا تھا۔ گویا تیسری سورۃ کو چوتھے اور چوتھی سورۃ کو تیسرے نمبر پر لکھا۔ اب یہ بھی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں سورۃ نسا کو آل عمران سے پہلے پڑھا تھا۔ سو غالباً اسی سے حضرت ابن مسعود نے رائے قائم کر لی ہوگی۔ اب صرف یہی دو اختلاف ہیں۔ جو ان کی ترتیب میں پائے جاتے ہیں۔ جن پر معترض شور مچاتے ہیں امام بخاری نے ایک حدیث کو نقل کیا ہے جس میں ابن مسعود نے سورہ بنی اسرائیل۔ الکہف۔ طٰہٰ۔ مریم اور انبیا کو درمیان قرآن شریف میں ٹھیک اسی ترتیب سے بیان فرمایا۔ جس ترتیب سے یہ سورتیں اصل ترتیب قرآنی میں واقع ہیں۔ اس قسم کی شہادتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے نسخوں کی ترتیب ایک ہی تھی۔ اور اگر کوئی اختلاف تھا تو وہ نہایت ہی خفیف اور چھوٹا سا تھا۔ اور اس کی وجہ صرف حضرت ابن مسعود کی غلط فہمی تھی۔ اور صحابہ نے اُن کی ترتیب کو قبول نہ کر کے اس غلطی کی حقیقت کو کھول دیا۔

ابی بن کعب اور حضرت علی کی ترتیب مع غور

ترتیب سور کے اختلاف میں ابن مسعود کے علاوہ دو اور بزرگوں کا نام لیا جاتا ہے یعنی ابی بن کعب

اور حضرت علی۔ لیکن اعتبار کے قابل کوئی شہادت موجود نہیں جس سے اس امر کا ادنیٰ سا ثبوت بھی مل سکے کہ ابی بن کعب کسی مختلف ترتیب کے قایل تھے۔ اُن کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ چوتھی سورۃ النسار کی جگہ آل عمران کو جو تیسری سورۃ ہے رکھتے تھے۔ اور تیسری کی جگہ چوتھی رکھتے تھے۔ اگر یہی اختلاف تھا تو یہ نہایت خفیف سی بات تھی اور ممکن ہے کہ انہوں نے بھی ابن مسعود کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں پڑھتے سن کر ایسا سمجھ لیا ہو لیکن ہم آگے چل کر ثابت کریں گے کہ حضرت ابی بن کعب اس اختلاف کے مرتکب نہیں ہوئے۔ اور اگر کبھی انہوں نے اس قسم کا اختلاف کیا بھی تھا تو واقعات پر مطلع ہوتے ہی وہ اس پر قایم نہ رہے اور اپنے ہی عمل سے ثابت کر دیا کہ ترتیب نبوی وہی ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صحیفوں میں ملحوظ رکھی گئی۔ ایسا ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت بیان کیا جاتا ہے۔ کہ انہوں نے قرآن شریف کو نزولی ترتیب کے موافق جمع کیا تھا چنانچہ اس کی تائید میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے۔ جس میں اُن کا قول اس مضمون کا نقل کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انہوں نے اس وقت تک آرام نہ کیا۔ جب تک کہ سارے قرآن شریف کی سورتوں کو تاریخی یعنی نزولی ترتیب دیکر جمع نہ کر لیا۔ لیکن یہ حدیث مجروح ہے کیونکہ باوجودیکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد سریر خلافت پر بھی رونق افروز ہو گئے پر کوئی ایسا قرآن جس کا اس حدیث میں ذکر ہے نہ شایع ہوا اور نہ آیندہ نسلوں کے ہاتھوں میں پہنچایا گیا۔ اس کے علاوہ صحیح احادیث سے اس واقعہ کی صحت کے خلاف ثبوت ملتا ہے فتح الباری کے صفحہ ۱ پر خود حضرت علی کی روایت سے ایک حدیث درج ہے۔ عن عبد خیرۃ ال سمعت علیا یقول اعظم الناس فی المصاحف اجرا ابوبکر رحمہ اللہ علی ابی بکر ھو اول من جمع کتاب اللہ یعنی قرآن شریف کے جمع کرنیوالوں میں سب سے بڑے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہی سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن جمع کیا،" تو حضرت علی خود تسلیم کرتے ہیں۔ ابوبکر صدیق ہی وہ شخص تھے جنہوں نے سب سے پہلے قرآن کریم کو جمع کیا۔ اس کے مقابل کسی دوسرے کی روایت کہ حضرت علی نے بعد وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آرام نہیں کیا جب تک کہ قرآن شریف کو جمع نہیں کر لیا۔ مردود ٹھیرتی ہے۔ اور یہ حدیث اپنے ثبوت میں اکیلی نہیں بلکہ دوسرے تاریخی واقعات اس کے موید اور مصدق ہیں۔ جن میں ایک بات تو یہ ہے کہ حضرت علی نے اپنی خلافت کے زمانہ میں بھی کسی دوسری ترتیب کا نہ ذکر ہی کیا اور نہ ہی موجودہ مسلمہ ترتیب سے مختلف ترتیب والا قرآن کسی کو دکھایا۔ لیکن اس کے ماسوا ابھی ایک اور ایسی زبردست بات ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو حضرت علی اور نہ حضرت ابی رضی اللہ عنہما اس ترتیب سے مخالف کسی دوسری ترتیب پر عملدرآمد رکھتے تھے

جو حضرت عثمان کے صحیفوں میں ملحوظ رکھی گئی تھی کیونکہ حضرت ابی بن کعب اور حضرت علی رضی اللہ عنہما دونوں بزرگوں کی سرپرستی میں قرآن کریم کی نقلوں کا کام بعہد خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سرانجام پایا تھا اور اس وقت ان کو اس کام میں حضرت عثمان کے برابر دسترس حاصل تھی اور جس طرح انہوں نے ہم کو موجودہ قرآن مجید پہنچایا۔ اسی طرح اگر کوئی اور ترتیب اُن کے خیال میں ہوتی تو بجائے اسکے اس کو باسانی ہم تک پہنچا سکتے تھے۔ اور کوئی مانع نہ تھا۔

سورہ انفال اور توبہ کا تعلق

اس موقعہ پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت پر نظر ڈالی جاوے جو قرآن شریف کی سورتوں کی ترتیب کے متعلق برعکس نتائج کے ساتھ پیش کی جاتی ہے اور وہ روایت یہ ہے عن ابن عباس قال قلت بعثمان ما حملکم علی ان عمد تم الی الانفال وھی من المثانی الی براۃ وھی من المئین فقرنتم بھما ولم تکتبو ابینھما سطر بسم اللہ الرحمن الرحیم ووضعتموھما فی السبع الطوال فقال عثمان کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثیرا ما ینزل علیہ السور ذوات العدد فاذا نزل علیہ الشئ یعنی منھا دعا بعض من یکتب فیقول ضعوا ھؤلاء الایت فی السورۃ التی یذکر فیھا کذا وکانت الانفال من اوائل ما نزل بالمدینۃ وبراءۃ من اخر القران وکان قصتھا شبیھۃ بھا فظننت انھا منھا فقبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و لم یبین لنا انھا منھا۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عثمان سے پوچھا کہ آپ کیوں سورہ انفال کو جو مثانی میں سے ہے سورہ براۃ کے ساتھ جو طوال میں سے ہے ایسے اتصال سے لکھا ہے کہ اُن کے درمیان بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں لکھی۔ اور اس طرح ان دونوں سورتوں کو سات لمبی سورتوں میں شامل کر دیا ہے۔ حضرت عثمان نے کہا کہ آنحضرت صلعم کی عادت تھی کہ جب ایک ہی وقت بہت سی سورتیں آپ پر نازل ہوتیں اور اُن میں کی کسی سورت کی آیت کا نزول ہوتا تو کسی کاتب وحی کو بلا لیتے اور اس کو حکم دیتے کہ وہ آیت فلاں سورہ کے فلاں موقع پر لکھ دو۔ سورہ انفال مدینہ میں ابتدائی زمانہ میں آنحضرت صلعم پر نازل ہوئی۔ اور برأت کا نزول آخری زمانہ میں ہوا اور ان دونوں کا مضمون باہم متوافق اور ملتا جلتا تھا۔ اس لئے میں نے یہ خیال کیا کہ دوسری سورۃ پہلی سورۃ میں سے ہی ہے۔ آنحضرت صلعم وفات پا گئے اور انہوں نے ہمیں واضح طور پر یہ نہ فرمایا تھا کہ یہ سورہ اسی میں سے ہے"۔

بعض لوگ غلط فہمی سے اس روایت سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ گویا جمع اور ترتیب قرآن حضرت عثمان نے اپنے اختیار اور سمجھ کے موافق کی ہے۔ اور اس لئے اس حدیث کو اس دعوٰی کی تائید میں

بطور ثبوت پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس سے قطعاً یہ بات مستنبط نہیں ہوتی کہ حضرت عثمان کی رائے کو ترتیب قرآنی میں کوئی دخل تھا بلکہ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی آیات کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی کی ہوئی تھی۔ اور اس کے علاوہ حضرت عثمان کی وہ کمال درجہ کی احتیاط ثابت ہوتی ہے کہ جس سے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور عمل کو نہایت امانت کے ساتھ اس کام میں برتا۔ حالانکہ ساری سورتوں کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنے کا عام طور پر قاعدہ تھا۔ مگر اس سورۃ کے ساتھ بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنے کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ پاکر اپنی رائے کو اتنا بھی دخل نہ دیا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ہی اس پر لکھ دیتے۔ الفاظ روایت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ حضرت عثمان کے ترتیب دینے پر کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ صرف ایک امر کے متعلق حضرت ابن عباس نے اپنا اطمینان کرنا چاہا ہے۔ انکا سوال حضرت عثمان یا اُن کی مزعومہ ترتیب پر نہیں ورنہ واحد میں خطاب کرتے حملکہ عمد تم قرنتم نہ فرماتے۔ علاوہ ازیں ان بارہ آدمیوں میں جن کے سپرد حضرت عثمان نے نقل مصاحف کا کام کیا تھا حضرت ابن عباس کا نام بھی ہے پس جب وہ خود نقل کرنے اور کرانے والے تھے تو حضرت عثمان کو یہ کیونکر کہہ سکتے تھے کہ تم نے ایسا ایسا کیوں کیا۔ مطلب اُن کا صرف یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ حضرت عثمان کا جواب اس حقیقت کو کھلے طور پر واضح کر دیتا ہے۔ وہ جواب میں کہتے ہیں۔

فظننت انہا منہا فقبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یبین لنا انہا منہا

میرا خیال تھا کہ سورہ براۃ سورہ انفال کا ہی حصہ ہے۔ سو رسول اللہ صلعم فوت ہو گئے اور آپ نے کھول کر نہیں فرمایا کہ وہ اس کا حصہ ہے۔ تو اس کا مطلب تو صاف یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کی زندگی میں میرا ایسا خیال تھا کہ سورہ براۃ سورہ انفال کا ہی حصہ ہے۔ مگر رسول اللہ صلعم نے یہ کھول کر بیان نہیں فرمایا اور اس سے پہلے حضرت عثمان نے اسی سوال کے جواب میں بوضاحت بیان کیا کہ آیات اور سورتوں کی ترتیب خود آنحضرت صلعم کرتے تھے۔ پس بات اصل میں یہ ہے کہ ابن عباس حضرت عثمان سے اس کی وجہ دریافت کرتے ہیں کہ انفال اور براۃ کو ملا کر کیوں رکھا گیا۔ وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ آیتوں اور سورتوں کو جب نازل ہوتیں آنحضرت صلعم خود خاص خاص مقامات پر رکھواتے جس کا مطلب صاف ہو کہ آپ کی ہدایت سے ہی یہ دونوں بھی اس طرح رکھی گئیں۔ اس کے بعد حضرت عثمان اپنا خیال بیان کرتے ہیں کہ میرا خیال یہ تھا کہ انفال اور براۃ ایک دوسرے کا حصہ ہی ہیں۔ مگر رسول اللہ صلعم فوت ہو گئے اور آپ نے ایسا نہیں فرمایا۔ اس لئے میں اُن کو ایک دوسرے کا حصہ نہیں کہتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عثمان کا

یہ خیال کیوں ہوا کہ سورہ براۃ انفال کا ہی حصہ ہے اور یہ خیال بھی رسول اللہ صلعم کی زندگی میں ہی پیدا ہوا اور ابن عباس کے سوال پر کہ ان سورتوں کی یہ ترتیب کیوں ہے کہ ایک چھوٹی اور بڑی سورۃ اکٹھی رکھی گئی ہیں اور ان کے درمیان بسم اللہ بھی نہیں لکھی گئی وہ اس خیال کو ظاہر کرتے ہیں جواب اس کا ظاہری کہ جب آنحضرت صلعم نے انہیں اس طرح اکٹھا رکھوایا اور درمیان میں بسم اللہ نہ لکھوائی تو حضرت عثمان کو یہ خیال ہوا کہ انفال اور براۃ ایک ہی سورۃ ہیں۔ لیکن چونکہ نبی صلعم نے ایسا نہیں فرمایا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس خیال پر جزم نہیں کیا اور جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور جس حد تک فرمایا اسی پر قایم رہے۔ پس یہ روایت ایک مضبوط اور زبردست شہادت اس بات پر ہے کہ آیتوں اور سورتوں کی تمام ترتیب خود آنحضرت صلعم نے کی اور جو کچھ آپ نے کیا یا فرمایا اس سے صحابہ نے بال برابر بھی انحراف نہیں کیا۔

۵۔ مصاحفِ ابوبکر و عثمان

حضرت ابوبکر نے جمع قرآن میں کیا کام کیا

اس مرحلہ پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے جس کا جواب ہم نے آیندہ دینے کا وعدہ کیا تھا کہ اگر کل قرآن کریم ضبط تحریر و حافظہ میں مع ترتیب سور و آیات کے آچکا تھا۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وقت میں جیسا کہ صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے قرآن کریم کو جمع کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اس کا کیا مطلب تھا۔ جاننا چاہئے کہ اصل بات جیسا کہ معتبر روایات اور صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے یہی ہے کہ جمع قرآن کریم کا اصل کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کے ماتحت پورا کیا۔ خود قرآن کریم اس بات پر شاہد ہے جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے جو پہلے بھی نقل کی جاچکی ہے ان علینا جمعہ وقرانہ فاذا قرأناہ فاتبع قرانہ یہ سورہ قیامت کی آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھلے طور پر یہ وعدہ موجود ہے کہ جیسا قرآن کریم کا پڑھنا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھانا ہمارا یعنی وحی الٰہی کا کام ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی جمع بھی ہمارا یعنی وحی الٰہی کا کام ہے۔ پھر ایک دوسرے موقعہ پر جب کفار نے یہ اعتراض کیا کہ قرآن شریف ٹکڑے ٹکڑے کر کے کیوں نازل کیا گیا۔ اور سارا اکٹھا نازل کیوں نہیں ہوا اعتراض کو نقل کر کے اس کا جواب یوں فرمایا کذلک لنثبت بہ فؤادک ورتلنٰہ ترتیلا۔ یعنی ٹکڑے ٹکڑے کر کے نازل کرنے میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً وحی الٰہی کے نزول سے مورد وحی علیہ الصلوۃ والسلام کو تسکین ملتی رہے دیگر کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ان ٹکڑوں میں جوڑ کیونکر ہوگا۔ اور ان کی ترتیب کیا ہوگی کیونکہ ان کو ترتیب اور تدریج سے پڑھنا یہ بھی ہمارا ہی کام ہے غرضیکہ ایسی ایسی آیات اور ان واقعات سے جو ہم تفصیل کے ساتھ پہلے بیان کر چکے ہیں نہایت صفائی سے

یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جمع قرآن کا اصل کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں خود ہی کیا تھا۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ سوائے ان صحابہ کرام کے جو کل قرآن شریف کو حفظ رکھتے تھے۔ دوسروں کو جمع کی ترتیب کے ساتھ قرآن کریم کے حفظ رکھنے کی ضرورت پیش نہ آسکتی تھی۔ پس قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں پوری ترتیب کے ساتھ جمع تو تھا۔ لیکن یہ جمع شدہ قرآن کریم صرف حفاظ قرآن کے حافظوں میں ہی محفوظ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کتاب یا ایک جلد کی صورت میں قرآن شریف کو جمع نہ کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ایک آیت اور ہر ایک سورۃ نزول کے وقت تحریر میں بھی فی الفور محفوظ کرلی جاتی تھی۔ مگر جب تک مہبط وحی علیہ الف الف صلوۃ والسلام موجود تھے اور وحی کا نزول جاری تھا یہ سب تحریریں ایک جلد کی صورت میں جمع نہ ہو سکتی تھیں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ بعض سورتیں جو ابتداء مدنی زندگی میں نازل ہوئیں اُن کی بعض آیات اخیر زمانہ نبوی تک نازل ہوتی رہیں۔ پس اگر سورتوں اور آیات کو ترتیب دیکر ایک مجلد میں جمع کر دیا جاتا تو یہ مشکل پیش آتی کہ ایک سورۃ جو ساری لکھی جا چکی تھی اس کی کوئی آیت جب بعد میں نازل ہو اور بلحاظ ترتیب کے اس کا کسی سورۃ کے درمیان میں آنا ضروری ہو تو اسے کیا کیا جائے۔ حافظہ میں تو ایسی ترتیب کا دینا ہر وقت ایک آسان امر تھا۔ مگر تحریر میں جب درمیان کوئی جگہ نہ چھوڑی گئی ہو۔ جو قبل از وقت چھوڑی نہ جا سکتی تھی تو یہ دقت پیدا ہوتی کہ بعد کی نازل ہوئی ہوئی آیات جو ترتیب کے لحاظ سے کسی سورۃ کے اندر آنی چاہئیں اپنے موقعہ پر رکھی نہ جا سکتیں اسی مصلحت کے لحاظ سے آنحضرت صلعم نے اسی بات کو کافی سمجھا کہ جمع شدہ قرآن پوری ترتیب کے ساتھ حافظوں میں محفوظ رہے۔ مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے تو پھر قرآن شریف کے ایک کتاب کی صورت میں جمع کرنے کی جو دقتیں تھیں وہ جاتی رہیں۔ چنانچہ یہی ضرورت قرآن کریم کو ایک مجلد کی صورت میں جمع کرنے کی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں محسوس کی گئی۔ اور اسی کو پورا کرنے کے لئے حضرت ابوبکر نے زید کو جمع قرآن پر مامور کیا۔ تا کہ وہ تحریر اور ایک مجلد کی صورت میں اُسی ترتیب کے ساتھ قرآن کریم کو جمع کریں۔ جس ترتیب کے ساتھ یہ پاک کتاب حافظوں میں جمع تھی +

زید کا جمع مسودات قرآن پر مامور ہونا

جو کچھ میں نے یہاں بیان کیا ہے۔ اس کی تصدیق اس روایت سے ہوتی ہے جس میں حضرت ابوبکر کے وقت میں جمع قرآن کے واقعہ کی تفصیل ہے۔ یہ روایت صحیح بخاری کی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسیلمہ کذاب کے خلاف حضرت ابوبکر کو ایک مہم بھیجنی پڑی۔ اس جنگ میں کئی قرا شہید ہو گئے۔ جس پر حضرت عمر کو خطرہ ہوا کہ اگر اور لڑائیاں ایسی ہی خطرناک پیش آجائیں تو ممکن ہے کہ سب کے سب قاری یعنی حافظ لوگ شہید ہو جائیں اور اس طرح سے قرآن شریف کا کوئی حصہ ضایع ہو جائے حدیث اس

طرح پر ہے۔ عن زید بن ثابت رضی اللہ عنہ قال ارسل الیّ ابوبکر الصدیق مقتل اھل الیمامۃ فاذا عمر بن الخطاب عندہ قال ابوبکر رضی اللہ عنہ ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامۃ بقراء القران وانی اخشی ان استحر القتل بالقراء بالمواطن فیذھب کثیر من القران وانی اری ان تامر بجمع القران قلت لعمر کیف تفعل شیئًا لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ھذا واللہ خیر ولم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری لذلک ورایت فی ذلک الذی رای عمر قال زید قال ابوبکر انک رجل شاب عاقل لا نتھمک وقد کنت تکتب الوحی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتتبع القران فاجمعہ فواللہ لو کلفونی نقل جبل من الجبال ما کان اثقل علی مما امرنی بہ من جمع القرآن قلت کیف تفعلون شیئًا ولم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ھو واللہ خیر فلم یزل ابوبکر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری للذی شرح لہ صدر ابی بکر وعمر رضی اللہ عنہما فتتبعت القران اجمعہ من العسب واللخاف و صدور الرجال حتی وجدت اٰخر سورۃ التوبۃ مع ابی خزیمۃ الانصاری لم اجدھا مع احد غیرہ لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حتی خاتمۃ براءۃ فکانت صحف عند ابی بکر حتی توفاہ اللہ ثم عند عمر حیاتہ ثم عند حفصۃ بنت عمر رضی اللہ عنہ **ترجمہ**

زید بن ثابت سے روایت ہے کہ اہل یمامہ کے قتل کے بعد یعنی ان صحابہ کے جو جنگ یمامہ میں شہید ہوئے حضرت ابوبکر صدیق نے مجھے بلا بھیجا جب میں آپ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ حضرت عمر بن خطاب بھی آپکے پاس موجود ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ ابھی عمر میرے پاس آئے اور مجھے کہا کہ یمامہ کی جنگ میں قرآن کریم کے قاریوں میں بہت قتل واقعہ ہوا ہے۔ اور میں ڈرتا ہوں کہ اگر اور میدانوں میں بھی ایسے ہی قاری لوگ (یعنی حافظان قرآن کریم) قتل ہوتے رہے تو بہت سا حصہ قرآن شریف کا گم ہو جائیگا۔ اور میری یہ رائے ہے کہ آپ جمع قرآن کا حکم دیدیں۔ میں نے عمر کو کہا کہ تم کیونکر اس کام کو کرتے ہو۔ جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ عمر نے جواب دیا کہ خدا کی قسم اس میں بہتری ہے۔ پس عمر میرے ساتھ مباحثہ کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ کو اس کے لئے کھول دیا۔ اور میری بھی اس میں وہی رائے ہوگئی جو عمرؓ کی رائے تھی۔ زید کہتے ہیں کہ پھر ابوبکر نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔ کہ تم عقلمند اور جوان آدمی ہو۔ اور ہم تم پر کسی طرح کی تہمت نہیں لگا سکتے۔ اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی بھی لکھا کرتے تھے۔ پس قرآن کو تلاش کر کے اس کو ایک جگہ جمع کرو۔ خدا کی قسم ہے اگر مجھے اس بات پر مجبور کرتے کہ تم ایک پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کر دو تو یہ بات مجھے زیادہ دشوار معلوم نہ ہوتی بہ نسبت اس کے

کہ مجھے جمع قرآن کا حکم دیا۔ میں نے کہا تم کس طرح وہ کام کرتے ہو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا ابوبکر نے فرمایا واللہ یہی بہتر ہے۔ پس ابوبکر مجھے جواب دیتے رہے یہاں تک کہ خدا نے میرا سینہ اس بات کے لئے کھول دیا جس کے لئے اس نے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے سینے کھولے تھے۔ پس میں نے قرآن کو تلاش کرنا شروع کیا اور میں اسے جمع کرتا تھا کھجور کی ٹہنیوں اور پتھر کی تختیوں سے اور آدمیوں کے سینوں یعنی حافظوں سے یہاں تک کہ اخیر سورہ توبہ مجھے ابی خزیمہ انصاری کے پاس سے ملا اور اور کسی کے پاس وہ مجھے نہیں ملا یعنی لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم سے براۃ کے خاتمہ تک پس یہ صحیفے حضرت ابوبکر کے پاس تھے۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ نے ان کو وفات دی پھر حضرت عمر کی زندگی میں اُن کے پاس رہے اور اسکے بعد ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس +

روایت جمع سے چند نتائج

اس روایت سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں سب سے اول اس سے یہ امر نہایت صفائی سے ثابت ہوتا ہے کہ کل کا کل قرآن شریف قرا یعنی اُن لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات اور آپ کے سامنے اسے حفظ کر چکے تھے۔ حضرت عمر نے جو اندیشہ ظاہر کیا وہ یہ تھا کہ اگر قرا سب کے سب مارے جائیں تو قرآن کریم کے بہت سے حصے کے ضایع ہو جانے کا اندیشہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر حافظان قرآن کریم کی زندگیاں خطرے میں نہ ہوں تو قرآن شریف کے بھی ضایع ہونے کا کوئی خطرہ نہیں۔ گویا حافظان قرآن کے سینوں میں بلا کم و کاست سارا قرآن شریف جمع تھا۔ دوسری بات جو اس روایت سے ثابت ہوتی ہے یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں جو جمع قرآن شریف کا کام کیا گیا۔ اس کی غرض یہ تھی کہ حافظان قرآن کریم یعنی قراء کے قایم مقام ایک اور امر پیدا ہو جائے یعنی قرآن کریم اس صورت میں جمع ہو جائے۔ کہ تمام قرا کے مارے جانے کی صورت میں بھی اس کے کسی فقرہ یا لفظ کے تلف ہو جانے کا خطرہ باقی نہ رہے۔ حضرت عمر کس بات کا اندیشہ ظاہر کرتے ہیں؟ صرف یہی کہ جیسے یمامہ کے جنگ میں کئی قرا مارے گئے۔ اگر ایسے ہی خطرناک جنگ اور پیش آجائیں۔ تو باقی حافظان قرآن کی زندگیاں بھی معرض خطر میں ہیں۔ پس آپ نے اس بات پر زور دیا کہ قرآن کریم حافظوں میں ہی جمع نہ رہے بلکہ ایسی جمع قرآن شریف کی کی جاوے۔ جس کو بعض انسانوں کے مارے جانے کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرح سے یعنی حافظوں میں تو قرآن کریم سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع کر دیا تھا۔ مگر حضرت عمر یہ چاہتے تھے کہ تحریر میں بھی قرآن شریف جمع ہو جائے تا قاریوں کے مارے جانے سے قرآن کریم کے کسی لفظ کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ روایت نہیں کہتی کہ قرآن کریم اس وقت تک جمع نہ ہوا تھا بلکہ برخلاف اس کے اس کی شہادت کھلے طور پر اس بات کو تو

ثابت کرتی ہے کہ سینوں میں قرآن شریف بالکل محفوظ تھا پر یہ اندیشہ ہوا کہ اگر وہ سینے جن میں یہ پاک کلام محفوظ تھا وہی نہ رہیں یعنی حافظ لوگ سب کے سب جنگوں میں شہید ہو جاویں تو پھر کیا ہوگا۔ اس خطرہ کے مقابلہ کے لئے تحریر میں اور ایک مجلد کی صورت میں قرآن کریم کا جمع کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اس روایت سے یہ بھی نہیں سمجھنا چاہئے کہ حضرت عمر کو قراء کے حافظوں پر اعتبار نہ تھا۔ حافظوں پر تو پورا اعتبار تھا لیکن قراء کی زندگیاں خطرناک لڑائیوں کے پیش آجانے کی وجہ سے معرض خطر میں پڑ گئی تھیں۔ تیسری بات جو اس حدیث سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت تک جب مجلد کی صورت میں جمع قرآن کا کام شروع کیا گیا۔ قرآن شریف کا کوئی حصہ ضایع نہ ہو چکا تھا۔ حضرت عمر صاف الفاظ میں یہ فرماتے ہیں۔ کہ میں ڈرتا ہوں کہ اگر باقی قراء بھی لڑائیوں میں شہید ہو جائیں اور دفعۃً کسی جنگ میں سب کا خاتمہ ہو جائے تو قرآن شریف کا کوئی حصہ ضایع ہو جائے۔ حضرت عمر کا اندیشہ صرف آیندہ کے متعلق تھا۔ اُن کے کسی لفظ سے یہ نہیں پایا جاتا کہ اسوقت بھی قرآن شریف کا کوئی حصہ یا کوئی لفظ ضایع ہو چکا تھا۔ بلکہ اُنکے الفاظ کا جس میں انھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ جو قراء یعنی حافظان قرآن کریم اس وقت موجود ہیں اُنکے مارے جانے سے قرآن کریم کے کسی حصہ کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے یہ صاف شہادت ملتی ہے کہ اس وقت تک کچھ ضایع نہ ہوا تھا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ سارا قرآن شریف جمع ہو کر قراء یعنی حافظان قرآن کریم کے حافظوں میں پورے طور پر محفوظ تھا۔ اور کہ حضرت عمر اس جمع کے علاوہ جو سینوں میں محفوظ تھی ایک جمع قرآن کریم کی ایسی چاہتے تھے جو کتاب کی صورت میں ہو اور کہ جب تحریری جمع کا کام شروع کیا گیا تو اس وقت تک حافظوں کے جمع شدہ قرآن شریف میں سے کوئی حرف یا کوئی لفظ ضایع نہ ہوا تھا۔ یہ تین نہایت ضروری باتیں ہیں جن کو یاد رکھنا چاہئے کیونکہ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو قرآن شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے حافظوں میں جمع کر کے محفوظ کر دیا تھا وہ بلا کسی تغیر و تبدل کے اور بغیر کسی حرف کے بڑھائے جانے یا گھٹائے جانے کے اسی ترتیب کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔

جمع مسودات پر بحث

اب ہم نے یہ دکھانا ہے کہ حضرت ابو بکر کا ان الفاظ سے کیف تفعل شیئًا لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا اس کو تم کیونکر کر سکتے ہو۔ کیا منشا تھا۔ یہ الفاظ حضرت ابو بکر کے عمرؓ کی کسی تجویز کے متعلق تھے۔ پس جو تجویز پیش کی گئی تھی اسی کے متعلق یہ جواب بھی ہونا چاہئے اب یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمر کی تجویز مطلق جمع قرآن کے متعلق نہ تھی بلکہ یہاں تک تو وہ مطمئن تھے۔ کہ قرآن کریم حفاظ اور قراء کے سینوں میں جمع ہے فکر

اُن کو یہ ہوا تھا کہ اگر حفاظ سب کے سب شہید ہو جاویں تو ایسا نہ ہو کہ قرآن شریف کا کوئی حصہ ضایع ہو جائے اس لیئے انہوں نے قرآن کریم کے ایک مجلد کی صورت میں جمع کرنے کی تجویز پیش کی تھی جو قرا کے نہ ہونے کی صورت میں بھی محفوظ کی محفوظ ہی ہو۔ دوسری طرف یہ امر بھی مسلم ہے کہ اگرچہ مکمل اور جمع شدہ قرآن شریف سورتوں اور آیتوں کی صحیح ترتیب کے ساتھ نہایت محفوظ طور پر حافظان قرآن کریم کے حافظوں میں موجود تھا۔ مگر جو تحریریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے روبرو لکھوائی تھیں جیسا کہ ہر ایک آیت اور ہر ایک سورت کا لکھا جانا ثابت ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سب کی سب ایک جگہ جمع نہ کی گئی تھیں اور نہ ہی اُن کو کوئی ترتیب دی گئی تھی۔ اور جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے مہبط وحی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں اُن تحریروں کی جمع اور ترتیب ہو بھی نہ سکتی تھی کیونکہ حافظان قرآن کے لئے تو یہ ایک آسان امر تھا کہ جب کوئی نئی آیت نازل ہوتی اور ان کو بتا دیا جاتا کہ اس کو فلاں سورۃ میں فلاں آیت کے بعد پڑھو۔ تو وہ آسانی سے یہ کر سکتے تھے۔ مگر ایک مکمل مجلد میں بعد میں ایسی آیتیں داخل نہ ہو سکتی تھیں۔ اب حضرت عمر نے دیکھا کہ قرا کی زندگیاں دشمنوں کے ہاتھ سے خطرے میں ہیں۔ تو آپ نے نہایت دور اندیشی کے ساتھ حضرت ابوبکر سے یہ درخواست کی کہ وہ ان تحریروں کے جمع کرنے کا حکم دیں۔ یہ وہ کام تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نہیں کرایا تھا۔ اس لئے حضرت ابوبکر نے پہلے یہی جواب دیا۔ کہ جس کام کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا اس کو تم کیونکر کر سکتے ہو اس جواب سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہی ہے کہ آنحضرت صلعم کے صحابہ وحی الٰہی کے متعلق پرلے درجے کی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ یہ بھی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امر پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے درمیان خوب بحث ہوتی جیسا کہ فلم یزل عمر یراجعنی سے ثابت ہے یعنی حضرت عمر میری باتوں کا جواب دیتے رہے۔ اب اس حدیث شریف میں اس بات کا کچھ تذکرہ نہیں کہ کیا سوال تھے اور کیا جواب تھے۔ مگر اخیر نتیجہ اس کا یہ لکھا ہے کہ حضرت عمر کی بات بوجہ اس کے کہ وہ قوی تر وجوہ اور مضبوط تر دلائل پر مبنی تھی حضرت ابوبکر نے بھی تسلیم کر لی۔ بلکہ جب زید رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت ابوبکر کی طرح پہلے یہی جواب دیا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا اس کو تم کیونکر کر سکتے ہو تو انہی دلائل سے حضرت ابوبکر نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو قایل کیا۔ اور آخر انہیں بھی اسی کو تسلیم کرنا پڑا۔ قیاس سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا ہوگا کہ اگر تحریری طور پر قرآن شریف کو جمع کرنے کا منشا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ ہوتا تو آپ اس قدر احتیاط کیوں فرماتے کہ جبھی ایک آیت نازل ہوئی اسی وقت کاتبان وحی کو بلوا کر اسے لکھوا لیا۔ اور پھر یہ بھی بیان کیا ہوگا کہ تحریر میں جمع کرنے سے ہم کوئی نیا

کام نہیں کرتے بلکہ جمع تو اصل میں خود رسول اللہ علیہ وسلم ہی کر چکے ہیں اور تمام و کمال ترتیب کے ساتھ اسے حفاظ کے سینوں میں محفوظ کر چکے ہیں۔ ہم نے صرف اسی جمع کا تتبع کر کے اصل تحریروں کو ایک مجلد کی صورت میں جمع کر دینا ہے یہ چونکہ واقعات حقّہ تھے اس لئے حضرت ابوبکر اور زید اور پھر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے اُن کو تسلیم کیا۔ غرض کہ نہ حضرت عمر کی تجویز مطلق جمع کے متعلق تھی اور نہ ہی حضرت ابوبکر کے جواب کا منشا یہ تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے قطعاً قرآن کو جمع ہی نہیں کیا۔ بلکہ یہ تجویز اور جواب دونوں تحریری جمع کے متعلق تھے۔

جمع سورات کی مشکلات

اسی حدیث میں یہ الفاظ جو زید نے مشکلات کا خیال کر کے کہے کہ اگر مجھے ایک پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل کرنے کے لئے کہا جاتا تو مجھے جمع قرآن کی تجویز کی نسبت زیادہ دشوار نہ معلوم ہوتا ان الفاظ کو بعض کوتہ اندیش کم فہم معترضین نے محل اعتراض بنایا ہے اور اُن سے وہ یہ مطلب نکالنا چاہتے ہیں کہ گویا قرآن شریف اس وقت ایک ایسی پراگندہ صورت میں تھا کہ زید رضی اللہ عنہ اس کے جمع کرنے کو پہاڑ کے اٹھانے کی طرح ناممکن سمجھتے تھے۔ ایسی بین شہادتوں کے ہوتے ہوئے جن سے صفائی سے ثابت ہو رہا ہے کہ صحابہ کی جماعت میں بہت سے حافظ قرآن کریم کے موجود تھے۔ اور کل قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عین حیات میں جمع ہو چکا تھا۔ ایسی دور از قیاس باتوں کو پیش کرنا حماقت اور تعصب کی انتہائی حد ہے۔ زید کو تو خود اس لئے بھی یہ تجویز دشوار معلوم ہو رہی تھی کہ اُن کے ذہن میں ابھی تک یہ بات نہ آئی تھی کہ جب تحریروں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع نہیں کیا تو اور کوئی کیونکر کر سکتا ہے چنانچہ ساتھ ہی وہ یہ کہتے ہیں کہ تم اس کام کو جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا کیونکر کر سکتے ہو لیکن اگر یہ بھی مان لیں کہ انہوں نے جمع قرآن کی مشکلات کو مدنظر رکھ کر یہ الفاظ بولے تو بھی کوئی ہرج نہیں کہ اس سے یہ قیاس نہیں ہو سکتا کہ اس سے پہلے قرآن شریف مطلقاً جمع ہی نہ ہوا تھا۔ تجویز حضرت عمر کی تحریروں کو جمع کرنے کی تھی اور یہ واقعی ایک بڑا مشکل اور بھاری کام تھا۔ چنانچہ اس کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کو ابی داؤد نے مصاحف میں بیان کیا ہے۔ قال قام عمر فقال من كان تلقى من رسول الله صلى الله عليه وسلم شيئاً من القران فليات به وكانوا يكتبون ذلك فى الصحف والالواح والعسب قال وكان لا يقبل من احد شيا حتى يشهد شاهدان راوی کہتا ہے کہ حضرت عمر کھڑے ہوئے اور عام اعلان کیا کہ جس کو قرآن شریف کا کوئی ٹکڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست پہنچا ہو وہ اسے لے آئے اور وہ یعنی صحابہؓ قرآن شریف کاغذوں اور تختیوں اور کھجور کی شاخوں پر لکھ لیا کرتے تھے پھر وہی راوی کہتا ہے کہ کسی سے کوئی چیز (یعنی لکھا ہوا قرآن کا ٹکڑا) قبول نہ کیا جاتا۔

جب تک کہ دو گواہ گواہی نہ دیتے۔ فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۲۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے اور یہی شہادت حدیث زیر بحث سے بھی ملتی ہے۔ کہ حضرت ابوبکر کے وقت میں جمع قرآن کا منشا ان اصل تحریروں کو اکٹھا کرنے کا تھا۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں لکھی گئی تھیں۔ پس یہی وہ مشکل تھی جس کو مدنظر رکھکر زید نے اس کام کو اس قدر دشوار سمجھا۔ قرآن کریم کا بہت سا حصہ مکہ میں نازل ہو چکا تھا اور جو مدینہ میں نازل ہوا تھا وہ بھی سارا زید کے قبضہ میں نہ تھا۔ کیونکہ زید کی غیر حاضری میں بعض وقت اور کاتب بھی لکھنے کے لئے بلا لئے جاتے تھے۔ حضرت زید کو منتخب اس لئے کیا گیا کہ مدینہ میں جس قدر قرآن کریم نازل ہوا تھا اس کا اکثر حصہ زید نے ہی لکھا تھا۔ اور غالباً وہ سب مسودات انہی کے قبضہ میں تھے مگر اس کام کو انجام دینا واقعی ایک بڑا دشوار امر تھا۔ تمام اصلی تحریروں کو جس جس کے قبضہ میں وہ تھیں وہاں سے تلاش کرنا تھا۔ اور پھر اُن کو اس ترتیب کے ساتھ جو حافظان قرآن کے سینوں میں محفوظ تھی ترتیب دینا تھا۔ ہاں اس قدر وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایسی تحریروں میں سے ضایع کچھ نہ ہوا تھا۔ بلکہ جس کسی کے پاس تھیں نہایت حفاظت سے رکھی ہوئی تھیں کیونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کے متعلق صحابہ نہایت احتیاط سے کام لیتے تھے اور یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ان تحریروں کو ضایع کر دیتے جن کو وہ اپنی جانوں سے بھی عزیز تر سمجھتے تھے۔ بہر حال یہ ایک مشکل کام تھا اور ان تمام مشکلات کے پورے پورے احساس نے ہی زید کے منہ سے یہ الفاظ نکلوائے۔ کہ یہ کام اُن کو ایک پہاڑ نظر آیا۔

جمع ابوبکر میں اصلی مسودات کو جمع کیا گیا

اور بھی کئی باتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زید کے سپرد جو کام کیا گیا وہ ان اصلی تحریروں کو اکٹھا کرنا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھیں۔ حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا یہ منشا نہیں تھا کہ جس طرح حافظ لوگ قرآن شریف کو پڑھتے ہیں۔ اس کے مطابق ایک نسخہ لکھوا لیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر کے پہلے یہ لفظ تھے جو زید کو فرمائے۔ کہ قرآن کو تلاش کرو اور اکٹھا کرو۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ تلاش کرنے سے منشا تحریروں کو تلاش کرنا ہی ہو سکتا تھا۔ اگر منشا صرف اسی قدر ہوتا کہ حافظوں کو جمع کر کے جس طرح وہ قرآن شریف پڑھیں اسی کے مطابق ایک نسخہ لکھ لیا جاوے تو حضرت ابوبکر تلاش کرنے کا حکم نہ دیتے۔ کیونکہ یہ ثابت شدہ امر ہے کہ اس وقت تک سارا قرآن شریف حافظوں کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اور کوئی حصہ اس کا ضائع نہ ہوا تھا۔ نہ ہی زید اس صورت میں کام کو اس قدر مشکل سمجھ سکتے تھے کہ وہ ان مشکلات کو ایک پہاڑ کیساتھ تشبیہ دیتے۔ ایسی صورت میں یہ کافی تھا کہ چند حافظوں کو جمع کر لیا جاتا اور جس طرح وہ لکھواتے جاتے اسی طرح حضرت زید لکھتے جاتے۔ اور اس طرح صحت کا پورا اہتمام ہو سکتا تھا۔ مگر حضرت عمر کا مدعا اصل تحریروں کو جمع کرنا تھا۔ جو آنحضرتؐ کی ہدایت سے لکھی گئی تھیں۔

تا اس طرح پر نہ صرف طرز تحریر ہی محفوظ ہو کر آئندہ نسلوں تک پہنچ جائے۔ بلکہ اصل کی تصدیق بھی دوسرے طور پر ہو جاوے۔ اور حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زید نے اسی کے مطابق کارروائی شروع کی۔ اور حضرت عمر کے منشا کو پورا کیا۔ کیونکہ جب اُن کو معلوم ہو گیا کہ حضرت عمر اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما حق پر ہیں تو پھر وہ اپنی کارروائی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ کہ پھر میں نے قرآن کو تلاش کرنا شروع کیا میں اس کو جمع کرتا تھا کھجور کی ٹہنیوں اور پتھر کی تختیوں سے اور آدمیوں کے سینوں سے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید دو کام کرتے تھے۔ اول وہ قرآن شریف کو تلاش کرتے تھے۔ اور پھر اس کو جمع کرتے تھے۔ اب جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے۔ جمع کے مفہوم میں ترتیب ضروری پڑی ہوئی ہے۔ مگر یہ ترتیب صرف ان تحریروں سے نہ ہو سکتی تھی جو متفرق طور پر کچھ کسی اور کچھ کسی کے قبضہ میں تھیں۔ لہذا ترتیب کے لئے اور جمع نبوی کی پیروی کرنے کے لئے ضروری ہوا کہ جب تحریر مل جائے تو پھر اس کو ترتیب دینے کے لئے قرّاء یعنی حافظان قرآن کی طرف رجوع کیا جائے یہی مراد حضرت زید کی "صدور الرجال" سے حدیث مذکور میں ہے کیونکہ بغیر اس جمع کی پیروی کے جو سینوں میں محفوظ ہو چکی تھی حضرت زید تحریری جمع کے کام کو پورا نہ کر سکتے تھے یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر نے یہ زور دیا تھا کہ تحریری جمع کے کام کو جلدی شروع کیا جائے۔ جب کہ ابھی بہت سے حافظان قرآن کریم زندہ تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ حضرت زید نے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ صدور الرجال کی طرف رجوع کیا حدیث کے الفاظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے بعض سورتوں کو تو قراء سے لے لیا اور بعض کے لئے تحریریں تلاش کیں۔ کیونکہ اگر حافظوں سے ہی قرآن کا اکٹھا کرنا اُن کا منشا ہوتا تو تحریروں کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی جب انہوں نے بعض سورتوں کو قراء پر اعتبار کر کے صدور الرجال سے لے لیا تھا تو باقی سورتوں کے لئے تحریریں تلاش کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ اور اگر تحریروں کی تلاش کی ضرورت تھی تو پھر سب حصوں کے لئے یکساں تھی۔ اگر حافظہ پر ہی زید نے انحصار کرنا ہوتا تو کیا یہ کافی نہ تھا کہ چند قراء کو جمع کر کے جو جیسا کہ حضرت عمر کے بیان سے پایا جاتا ہے ابھی بہت سے زندہ موجود تھے اور قرآن کریم پوری طرح سے اُن کے سینوں میں محفوظ تھا۔ جس طرح وہ پڑھ کر سناتے جاتے اسی طرح وہ لکھتے جاتے۔ تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی +

جمع سودات میں آنحضرت صلعم کی جمع کی پیروی کی گئی

اس جمع کے متعلق جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے ہوئی اہم ترین سوال یہ ہے کہ آیا یہ صحیفے اس جمع شدہ قرآن کریم کے ساتھ جیسا کہ وہ حافظوں اور قراء کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اور جس طرح کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پڑھا جاتا تھا۔ بعینہ مطابق تھے۔ یعنی آیا اُن میں کسی قسم کی کمی یا

بیشی یا ترتیب مضامین میں خلل تو نہیں ہوا تھا؟ بہت سے ایسے وجوہ ہیں جن پر غور کرنے سے یہ یقین کامل ہو جاتا ہے کہ اس مجموعے میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا تھا اور نہ کوئی کمی بیشی ہوئی تھی۔ اول جو لوگ اس کام کی تکمیل چاہتے تھے انہیں ہرگز کسی کی غرض یہ نہ تھی کہ کسی قسم کا تغیر و تبدل ہو۔ بلکہ وہ دل و جان سے اور پوری ہمت و مستعدی سے اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح قرآن شریف کمال حفاظت کے ساتھ آیندہ نسلوں تک پہنچایا جائے۔ بلکہ اُن کے ایمان کبھی گوارا نہ کرسکتے تھے کہ کسی قسم کا نقص قرآن کریم کی حفاظت میں واقع ہو۔ دوم یہ جمع کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف چھ ماہ بعد شروع ہو گیا تھا۔ اور ابھی قریباً سب کے سب وہ صحابہ زندہ موجود تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے قرآن شریف سُنا اور حفظ کیا تھا۔ علاوہ حافظوں اور قُرّا کے دوسرے لوگ بھی جنہوں نے آنحضرت صلعم سے قرآن کو سُنا تھا اس قابل تھے کہ اگر کسی قسم کی کمی بیشی یا تغیر اس کلام پاک میں ہو تو وہ فوراً اس کو سمجھ جائیں پس ممکن نہ تھا کہ کوئی کمی بیشی یا تغیر ہوتا اور یہ بات خاموشی میں دب جاتی۔ سوم ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم حدیث کے نقل کرنے میں پرلے درجہ کی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ پس ممکن نہ تھا کہ وہ وحی الٰہی میں کوئی کمی بیشی یا تغیر کرنے کی جرات کرتے جس قدر عظمت اُن کے دلوں میں کلام الٰہی کی تھی اُس کے ساتھ افترا کا جمع ہونا یا عمداً کسی حصہ کو چھوڑ دینا ناممکن تھا۔ چہارم بہت سے اُن میں ایسے تھے جو سارا قرآن شریف حفظ رکھتے تھے اور ایک گروہ کثیر ایسا تھا جن کو بڑا حصہ قرآن شریف کا یاد تھا۔ کسی کو کوئی حصہ اور کسی کو کوئی حصہ اور جو کچھ کسی کو یاد تھا اس کی برابر تلاوت میں لگے رہتے تھے نمازوں میں بھی اور نمازوں سے باہر بھی۔ ایسے آدمیوں کی موجودگی میں یہ ناممکن تھا کہ کوئی کمی بیشی یا تغیر واقع ہو سکتا۔ پنجم صحابہ کے درمیان قرآن کریم کے اجزا کے بہت سے نسخے مروج تھے۔ اور یہ نسخے ابتدائی زمانہ سے ہی مروج تھے ہر ایک آیت یا حصہ جب نازل ہوتا تو پہلے ایک تحریر آنحضرت کے سامنے لکھی جاتی۔ پھر اسی سے صحابہ اپنے اپنے طور پر لکھ یا لکھوا لیتے۔ اب یہ نسخے متفرق طور پر کوئی کسی صحابی کے پاس اور کوئی کسی صحابی کے پاس موجود تھے اور اس مجموعہ کی صحت کو پرکھنے کے لئے جو زید رضی اللہ عنہ نے تیار کیا تھا کافی تعداد دوسری تحریروں کی موجود تھی ایسا ہی جو نسخہ ایک صحابی کے پاس تھا۔ اس کا مقابلہ دوسرے سے ہو سکتا تھا۔ اور اس طرح پر زید کے مجموعہ میں کسی غلطی کے داخل ہونے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ ایک طرف حافظہ کی زبردست شہادت اور دوسری طرف تحریر کی مضبوط گواہی ان دونوں میں سے ہر ایک بجائے خود ہی بڑی بھاری گواہی تصدیق صحت کے لئے کافی تھی مگر دونوں نے مل کر وہ کام کیا جس کی نظیر دنیا کی کسی دوسری کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ ششم کسی روایت یا حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ حضرت ابوبکر کے وقت میں جو جمع قرآن ہوئی

اس میں کچھ نقص تھا یعنی کوئی حصہ داخل ہونے سے رہ گیا تھا یا کوئی ایسا حصہ داخل ہو گیا تھا جو کلام الٰہی نہ سمجھا جاتا تھا۔ خود میور کو اس بات کا اقرار ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے "کوئی اجزا کوئی فقرے یا کوئی الفاظ ایسے نہیں سنے گئے جو جمع کرنے والوں نے چھوڑ دیئے ہوں نہ ہی کوئی ایسے پائے جاتے ہیں جو اس مسلم مجموعہ سے اختلاف رکھتے ہوں۔ اگر ایسے کوئی اجزا یا فقرے یا الفاظ ہوتے تو ضرور تھا کہ اُن کا تذکرہ ان احادیث میں پایا جاتا۔ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال کی نسبت چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی محفوظ رکھی گئی ہیں"۔

حضرت عثمان نے مجموعہ صحف حضرت ابوبکر کی پیروی کی

پس اس بات کے یقین کرنے کے لئے کہ حضرت ابوبکر کے حکم سے جو مجموعہ صحف تیار ہوا تھا وہ کیا بلحاظ ترتیب اور کیا بلحاظ عبارت کے اس مجموعہ سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ہدایت سے تیار ہو کر صحابہ کے سینوں میں محفوظ ہو چکا تھا پوری پوری مطابقت رکھتا تھا قوی ترین وجوہات موجود ہیں اگر ایسی مطابقت نہ ہوتی تو صحابہ کبھی اس مجموعہ کو جو زید نے تیار کیا تھا قبول نہ کرتے۔ یہ مجموعہ بعد تکمیل حضرت ابوبکر کے پاس رہا اور آپ کی وفات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہا۔ پھر آپ کی وفات کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ کے پاس رہا اور حضرت عثمان کے وقت میں انہیں کے پاس موجود تھا اس طرح پر یہ مجموعہ بغیر کسی تغیر و تبدل کے حضرت عثمان کے وقت تک پہنچ گیا۔ یہ بھی اغلب ہے کہ اس نسخہ سے دوسرے لوگوں نے اپنے اپنے لئے نسخے لکھ لیے ہوں اور اس طرح پر اس کی کافی اشاعت بھی ہو گئی لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بعض امور ایسے پیدا ہوئے کہ امیر المومنین نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ بڑی احتیاط اور حفاظت کے ساتھ اپنے اہتمام میں چند نسخے اسی اصل مجموعہ سے لکھوا کر شایع کئے جائیں اور ان نسخوں کی اشاعت کو جو اب تک بطور خود لوگوں نے لکھ رکھے تھے روک دیا جائے۔ چنانچہ وہ روایت جس میں ان واقعات کا تذکرہ ہے صحیح بخاری میں درج ہے اور حسب ذیل ہے: عن انس بن مالك ان حذيفة بن اليمان قدم على عثمان وكان يغازي اهل الشام في فتح ارمينية واذربيجان مع اهل العراق فافزع حذيفة اختلافهم في القراءة فقال حذيفة لعثمان يا امير المومنين ادرك هذه الامة قبل ان يختلفوا في الكتب اختلاف اليهود والنصارى فارسل عثمان الى حفصة ان ارسلي الينا بالصحف ننسخها في المصاحف ثم نردها اليك فارسلت بها حفصة الى عثمان فامر زيد بن ثابت وعبد الله بن الزبير وسعيد بن العاص وعبد الرحمن بن الحرث بن هشام فنسخوها في المصاحف وقال عثمان للرهط القرشيين الثلاثة اذا اختلفتم انتم وزيد بن ثابت في شيء من القرآن فاكتبوه بلسان قريش فانما نزل بلسانهم ففعلوا حتى اذا نسخوا الصحف في المصاحف رد عثمان

الصحف الیٰ حفصۃ فارسل الیٰ کل افق بمصحف مما نسخوا وامر بما سواہ من القراٰن فی کل صحیفۃ او مصحف ان یحرق **ترجمہ** انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حذیفہ بن الیمان حضرت عثمان کے پاس آئے اور ان دنوں وہ فتح ارمینیہ میں اہل شام کے ساتھ اور آذربیجان میں اہل عراق کے ساتھ جنگ کرتے تھے۔ وہاں ان لوگوں کی قرأت نے حذیفہ کو گھبرا دیا۔ پس وہ حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے امیر المومنین اس امت کی خبر لو۔ قبل اس کے کہ وہ کتاب میں ایسا اختلاف کرنے لگیں جیسا کہ یہود اور نصاریٰ کرتے ہیں اس پر حضرت عثمان نے حفصہ کے پاس آدمی بھیجا کہ صحیفے (یعنی مجموعہ قرآن جو حضرت ابوبکر کے وقت میں تیار ہوا تھا) ہمارے پاس بھیج دو ہم اس کی نقلیں مصحفوں میں کرلیں گے اور پھر اصل صحیفے آپ کو واپس بھیج دیں گے حفصہ نے ان صحیفوں کو حضرت عثمان کے پاس بھیج دیا اور حضرت عثمان نے زید بن ثابت اور عبداللہ بن زبیر اور سعید بن العاص اور عبدالرحمٰن بن حرث بن ہشام کو حکم دیا۔ پس ان لوگوں نے ان صحیفوں کو مصاحف میں نقل کیا۔ اور حضرت عثمان نے قریشی جماعت کو یہ بھی ہدایت فرمائی کہ جب تم اور زید بن ثابت (جو مدنی تھے) کسی امر میں اختلاف کرو تو اس کو قریش کی زبان میں لکھو۔ کیونکہ قرآن کریم انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ پس انہوں نے آپ کے احکام کی تعمیل کی اور جب صحیفوں کو مصاحف میں نقل کرچکے تو عثمانؓ نے وہ صحیفے حفصہ کو واپس بھیج دیئے اور ہر ایک طرف میں ایک مصحف ان میں کا جو لکھے گئے بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کے سوا جس صحیفہ یا مصحف میں قرآن لکھا ہوا ہو اسکو جلا دیا جائے۔

اس حدیث سے ان حالات کا اندازہ لگ سکتا ہے جنہوں نے حضرت عثمان کو اس حکم دینے پر مجبور کیا کہ تمام اوراق جن پر بطور خود بعض لوگوں نے قرآن شریف کل یا اس کا کوئی جزو لکھ لیا تھا جلا دیئے جائیں اور آیندہ کے لئے ان صحیفوں سے نقلیں لی جائیں جو خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت کے مجموعہ سے نقل کرائے تھے۔ حضرت عثمان کی افواج کا ایک جرنیل جو آرمینیا اور آذربائیجان میں جنگ کررہی تھیں آپ کے پاس آیا۔ اور یہ بیان کیا کہ لوگوں میں اختلاف قرأت ہورہا ہے یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اختلافات کا ہونا ملک شام اور آرمینیا وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے اور ایسے مقامات پر جیسے مکہ اور مدینہ یا عرب کے اندر ایسے اختلافوں کی کوئی شکایت نہیں کی گئی اب شام اور آرمینیا نئے نئے فتح شدہ ملک تھے اور اُن ملکوں کے لوگ جن کی زبان عربی نہ تھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ یہ اختلافات کس قسم کے تھے خود حذیفہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف قرأت یعنی پڑھنے کی طرز میں اختلافات تھے پھر یہ بھی اُن اختلافات کی نسبت بتایا گیا ہے کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے

سے اختلاف نہ تھے۔ ہاں یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر بروقت خبر نہ لی گئی تو یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے یہود اور نصاریٰ کے سے نہ ہو جائیں۔ کیونکہ اگر رفع اختلاف نہ کیا جائے تو ضرور ہے کہ مرور زمانہ سے وہ اختلاف کچھ کا کچھ رنگ پکڑ لیں واقعی کن کن الفاظ میں اور کیا کیا فرق تھا۔ اس کا جواب دینا ایک مشکل امر ہے مگر بعض دوسری روایات اور احادیث پر غور کرنے سے ان اختلافات کا کچھ پتہ لگتا ہے احادیث میں یہ ذکر موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض الفاظ کو لغت قریش کے سوا دوسری لغتوں میں ادا کرنے کی اجازت دی تھی۔ اور اس وقت بھی بعض لوگوں کو جن کو اس اجازت کی خبر نہ تھی ایسے لوگوں کو دیکھ کر اور سن کر جو کسی لفظ کو دوسری لغت میں ادا کرتے تھے ابتلا پیش آیا تھا چنانچہ ایک موقعہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ہشام کو پڑھتے سن کر ان کی گردن میں چادر ڈال کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو لے گئے کہ یہ غلط پڑھتا ہے اور آنحضرت صلعم نے ہشام کے پڑھنے کو صحیح قرار دیا۔ اس اجازت کی اصل وجہ یہ تھی کہ جب کثرت سے عرب اسلام میں داخل ہوئے تو اُن میں بعض اقوام ایسی تھیں جن کی بولی اگرچہ عربی تھی مگر خالص محاورہ قریش کے بولنے پر وہ قادر نہ تھے۔ اور ابتدا سے ہی ان کو بعض الفاظ کے خاص طریقوں پر ادا کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ پس اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ اجازت دی گئی کہ وہ لوگ جن حروف کو زبان قریش میں ادا نہیں کر سکتے انہیں اپنے محاورہ میں ہی اور اپنی طرز پر ادا کر لیں۔ یہ امر ظاہر ہے کہ مختلف حروف میں بعض الفاظ کو ادا کرنے کی اجازت ایک ضرورت پر مبنی تھی۔ اور اس اجازت سے وہ لوگ فائدہ اٹھا سکتے تھے جو بچپن سے بعض الفاظ کو خاص طور پر ادا کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اور محاورہ قریش ہی جس میں قرآن شریف نازل ہؤا تھا اُن کو ادا نہ کر سکتے تھے۔ مگر اب جب کہ اسلام کثرت سے عرب کے باہر پھیل گیا تو یہ ضرورت بھی ایک حد تک مفقود ہو گئی۔ کیونکہ جن لوگوں نے عربی زبان کو سیکھا تھا اور عربی انکی اپنی مادری زبان نہ تھی اُن کے لئے یہ برابر تھا کہ ایک لفظ کو محاورہ قریش میں ادا کریں یا کسی دوسری قوم کے محاورہ میں مگر بعض صحابہ جو ایسے مرکزوں میں قرآن کریم کی تعلیم دیتے تھے وہ اب تک قرآن شریف کو بعض دوسرے حروف پر پڑھاتے تھے۔ اور محاورہ قریش میں اُن کو ادا نہ کرتے تھے یہ بھی قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نے عمداً اور بلا وجہ بھی بعض قراتوں کو اختیار کر لیا تھا اور انہی کے مطابق نومسلموں کو بھی تعلیم دیتے تھے۔ کوفہ میں خصوصیت سے اس بات کا ہونا پایا جاتا ہے اور اس جگہ کے اختلافات کو دیکھ کر حذیفہ حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حذیفہ نے ان لوگوں کو ملامت کی جو اس قسم کی تفرقہ اندازی کرتے تھے۔ بعض کہتے تھے کہ ہم ابن مسعود کی قرات پڑھتے ہیں۔ *

* بعض کہتے تھے ہم ابی بن کعب کی قرات پڑھتے ہیں۔

کوئی کہتا تھا میری قرأت تمہاری قرأت سے بہتر ہے۔ بلکہ یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ بعض بعض کی انہی باتوں کی وجہ سے تکفیر کرنے لگے۔ کیونکہ وہ لوگ اسلام میں حدیث العہد ہونے کی وجہ سے اصلیت سے ناواقف تھے حالانکہ اگر پڑھانے والے احتیاط کرتے تو یہ سب لوگ اصل محاورہ قریش پر آسانی سے پڑھ سکتے تھے حضرت عمر کے وقت کا ایک واقعہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے۔ کہ حضرت عمر کے پاس خبر پہنچی کہ ابن مسعود حتیٰ حین کی بجائے عتیٰ حین پڑھاتے ہیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود کے نام حکم جاری کیا کہ قرآن شریف کا اصل نزول لسان قریش میں ہی ہے۔ پس آپ ہذیل کی لغت میں لوگوں کو قرآن نہ پڑھایئے۔ کیونکہ ہذیل حتیٰ کی بجائے عتیٰ بولتے تھے۔ جیسا کہ کسی عربی لغت کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اب اگرچہ حتیٰ حین کو عتیٰ حین پڑھنے کی اجازت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محاورہ ہذیل کے سبب سے دی۔ مگر ان نومسلموں کو ہذیل کی لغت پر قائم کرنا بلا ضرورت اختلافات ڈالنا تھا۔ اس لئے حضرت عمر نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو منع کیا دیکھو فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۲۴ ومن ثم انکر عمر علی ابن مسعود قرائتہ عتیٰ حین وکتب الیہ ان القراٰن لم ینزل بلغۃ ھذیل فاقرئ الناس بلغۃ قریش ولا تقرئھم بلغۃ ھذیل پس ایک تو یہ بلا ضرورت اختلاف قرات کو پھیلانا۔ اور پھر دوسری طرف ان نومسلموں کا ناواقفیت کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑنا جس سے فتنہ وفساد پھیلتا ہے۔ یہ ایسے امور تھے جنہوں نے حذیفہ اور عثمان رضی اللہ عنہما کے دلوں میں خطرہ پیدا کیا۔ اس کا علاج سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ مختلف حروف کو جن میں قرآن شریف کے پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی تحریر میں نہ لایا جائے بلکہ ایسے تمام نسخوں کو محو کر کے ایسے نسخے مناسب احتیاط سے لکھوا کر شایع کئے جائیں جو قریش کے محاورہ کے مطابق لکھے گئے تھے۔ کیونکہ یہی وہ محاورہ تھا جس میں قرآن کریم نازل ہوا اور دوسرے حروف میں پڑھنے کی اجازت بعد میں اور خاص ضرورتوں کے لئے دی گئی تھی۔ پس جب وہ ضرورتیں نہ رہیں تو اس اجازت کی بھی ضرورت نہ رہی۔

حضرت عثمان نے قرآن کو مطابق محاورہ قریش لکھوایا

اب جب ہمیں اُن اختلافوں کی جن کو دیکھ کر حذیفہ کو خطرہ پیدا ہوا تھا اور جن کی اصلاح عثمان رضی اللہ عنہ کے مدنظر تھی کچھ حقیقت معلوم ہو گئی تو اب یہ دیکھنا چاہئے کہ حضرت عثمان اس موقعہ پر قرآن شریف کے نقل کرنے میں کیا کیا خاص ہدایات دی تھیں جہاں تک اُن کا تذکرہ روایات میں ہے وہ یہ لفظ ہیں کہ اذا اختلفتم انتم وزید بن ثابت فی شیئ من القراٰن فاکتبوہ بلسان قریش فانہ نزل بلسانھم یعنی جب تمہارا اور زید بن ثابت کا کچھ اختلاف ہو تو قریش کی زبان میں لکھو۔ کیونکہ قرآن شریف قریش کی زبان میں ہی نازل ہوا ہے اور یہ بھی ساتھ ہی لکھا ہے ففعلوا ذلک

یعنی انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ حضرت عثمان نے اس سے آگے قدم نہیں رکھا جہاں حضرت عمر نے رکھا تھا۔ کیونکہ جیسا انہوں نے ابن مسعود کو لکھا تھا کہ ہذیل کے محاورہ پر قرآن شریف لوگوں کو مت پڑھاؤ۔ بلکہ قریش کی زبان میں پڑھاؤ کیونکہ قریش کی زبان میں ہی نازل ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت عثمان نے بھی اختلاف کے وقت لسان قریش کو ہی اختیار کیا۔ صرف فرق اتنا تھا کہ حضرت عثمان کے وقت میں نئے مسلمانوں کی بہت کثرت کے سبب سے اختلافات احرف یا قرأت بھی بڑھ گئے۔ بلکہ اُن سے بعض برائیاں پیدا ہونے لگیں۔ اس لئے حضرت عثمان نے اُن برائیوں کو سرے سے ہی اڑا دیا۔ ایک اور روایت میں جو وہ بھی بخاری کی ہے۔ روایت منقولہ "فی شئی من القرآن" کی بجائے الفاظ فی عربیۃ من عربیۃ القرآن وارد ہوئے ہیں جن سے ہماری بات کی تائید ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ اختلافات احرف محاورہ کے ہی اختلافات تھے کہ ایک شخص ایک لفظ کو ایک طرح پر بولتا یا لکھتا تھا اور دوسرا دوسری طرح پر۔ اب حضرت زید جنہوں نے حضرت ابوبکر کے وقت میں قرآن شریف کو جمع کیا تھا اور جواب بھی نسخے لکھنے پر متعین ہوئے تھے قریشی نہ تھے۔ مگر اُن کے ساتھ تین اصحاب اور قریشی تھے۔ اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے احتیاطاً یہ ہدایت کی کہ بصورت اختلاف لسان قریش کے مطابق لکھیں۔ اس اختلاف کی ایک مثال روایات سے معلوم ہوتی ہے جس کو ترمذی نے اس روایت کے ساتھ جو بخاری سے ہم نے اوپر نقل کی ہے ابن شہاب کی سند سے بیان کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے فاختلفوا یومئذ فی التابوت والتابوہ فقال القرشیون التابوت وقال زید التابوہ فرفع اختلافہم الی عثمان فقال اکتبوہ التابوت فانہ نزل بلسان قریش **ترجمہ** اس موقعہ پر زید اور قریشیوں کا اختلاف لفظ تابوت اور تابوہ کے متعلق ہوا قریش کہتے تھے کہ اس لفظ کو تابوت لکھنا چاہئے اور زید کہتے تھے کہ تابوہ لکھنا چاہئے یہ اُن کا اختلاف بالآخر حضرت عثمان کے سامنے پیش ہوا آپ نے فرمایا کہ تابوت لکھو کیونکہ قرآن شریف زبان قریش میں ہی نازل ہوا ہے اس واقعہ سے نہ صرف یہی پتہ لگتا ہے کہ زید اور قریش میں اختلاف کی کیا حقیقت تھی بلکہ اس سے ان اختلافات کا اندازہ بھی لگتا ہے جن کا ذکر حذیفہ نے کیا تھا جن اختلافوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دور کرنا چاہتے تھے۔ وہ زیادہ تر اسی قسم کے اختلاف تھے۔ یہ اختلاف ایک ضرورت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے جائز ہوگئے تھے مگر اب غیر عربی اقوام کے کثرت سے اسلام میں داخل ہونے سے یہ ضرورت باقی نہ رہی تھی اور اس لئے حضرت عثمان نے یہ ضروری سمجھا کہ اُن کو دور کر دیا جائے اور جیسا کہ ہم آگے چلکر سبعۃ احرف کی بحث میں دکھائیں گے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی کبھی یہ اجازت

نہ ہوئی تھی کہ ان اختلاف احرف کو تحریر میں لایا جائے یا قرآن شریف کے اندر لکھا جاوے۔ اسی قسم کے اختلافات کو دور کرنے کی غرض سے حضرت عثمان نے یہ حکم صادر فرمایا کہ تمام نسخے جو لوگوں نے بطور خود لکھ لئے ہیں۔ اور اس لئے اُن میں کافی احتیاط نہیں ہوئی محو کر دیئے جائیں چنانچہ ایک روایت میں اُن کے یہ الفاظ آئے ہیں محوت ما عندی فامحوا ما عندکم جو میرے پاس تھا میں نے محو کر دیا ہے پس جو تمہارے پاس ہے تم اُسے محو کر دو +

صحائف عثمانی صحف ابوبکر کی محض نقل تھے

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عثمان نے جو نسخے اس قدر احتیاط سے صحف ابی بکر رضی اللہ عنہ سے نقل کرائے ان میں اور اس اصل میں کوئی فرق تھا؟ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت ابوبکر والے صحف میں بغیر کسی تغیر و تبدل اور بغیر ادنیٰ سے ادنیٰ کمی زیادتی کے وہی قرآن شریف تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے اپنے سامنے صحابہ کو حفظ اور جمع کرایا تھا۔ پس اب اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ عثمانی صحیفے بعینہٖ صحف ابی بکر کی نقل تھے تو ہمارا مدعا ثابت ہو جاتا ہے یعنی یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لیکر آجتک قرآن شریف میں نہ کسی قسم کا تغیر و تبدل ہوا نہ کوئی کمی زیادتی ہوئی نہ اس کی ترتیب میں کچھ ادل بدل ہوا۔ بلکہ تمام و کمال حفاظت کے ساتھ وہی قرآن کریم ہمارے ہاتھوں تک پہنچا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو پڑھایا اور حفظ کرایا تھا۔ اور جو آپ کے روبرو لکھ لیا گیا تھا۔ اس سوال کو حل کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ حذیفہ کے بیان پر سب سے پہلی تجویز حضرت عثمان کو اختلافات دور کرنے کی کیا سوجھی وہ تجویز یہی تھی کہ آپنے معًا ام المومنین حفصہ کے پاس آدمی بھیجا کہ صحف ابی بکر ہمارے پاس بھیج دو۔ ہم اُن سے نقلیں اتروا کر واپس بھیج دیں گے۔ ایک غور کرنے والی طبیعت اس سے فی الفور سمجھ سکتی ہے کہ حضرت عثمان کیا کرنا چاہتے تھے انہوں نے جو ارادہ ظاہر فرمایا وہ صرف یہی تھا کہ حضرت ابوبکر والے صحف کی نقلیں کرا کر مختلف اطراف میں بھیج دی جائیں۔ اب حضرت ابوبکر کے وقت میں جمع کا اہتمام حضرت زید کے سپرد ہی تھا۔ اور اب بھی حضرت عثمان نے زید کے سپرد ہی یہ کام کیا۔ جس سے اور بھی وضاحت سے اُن کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحف ابی بکر سے کسی قسم کا اختلاف نہ کرنا چاہتے تھے۔ ہاں اس موقعہ پر انہوں نے یہ کیا کہ زید کے ساتھ تین قریشی اور لگا دیئے۔ بلکہ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بارہ آدمی اس کام پر متعین کئے گئے تھے اور ہدایت فرمائی کہ جب زید اور قریشیوں میں اختلاف کسی لفظ کی طرز تحریر کے متعلق ہو تو قریشیوں کے محاورہ میں وہ لفظ لکھا جائے کیونکہ قرآن شریف لسان قریش میں ہی نازل ہوا تھا۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ زید اور قریشیوں میں واقعی اختلافات ہوئے بھی تھے۔ بلکہ یہ ایک احتیاط تھی اگر کوئی اختلاف بھی ہوا تو وہ ایک لفظ سے زیادہ کا اختلاف نہ تھا۔ جیسا کہ ترمذی کی

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر صرف ایک ہی اختلاف لفظ تابوت کے لکھنے کے متعلق ہوا۔ اس کے سوائے اور کسی اختلاف کا جو زید اور قریشیوں کے درمیان ہوا ہو کوئی تذکرہ کسی روایت میں نہیں پایا جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو صحف حضرت ابوبکر کے وقت میں زید نے جمع کئے تھے اور جو حضرت عثمان نے اس موقعہ پر حضرت حفصہ سے منگوائے انہیں کی نقل بعینہٖ حضرت عثمان نے مصاحف میں کرائی اور اس نسخہ سے کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوا حضرت عثمان کے اپنے الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ حضرت حفصہ کو جو پیغام انہوں نے بھیجا وہ یہ تھا۔ ارسلی الینا بالصحف ننسخہا فی المصاحف ثم نردھا الیکِ آپ صحف کو ہمارے پاس بھیج دیں۔ تا کہ ہم اسے اور صحیفوں میں لکھ لیں۔ اور اصل پھر آپ کو واپس کر دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا یعنی چند صحیفے لکھوا کر اصل کو واپس کر دیا گیا۔ اگر اس اصل میں اور ان نسخوں میں جو حضرت عثمان نے لکھوائے کوئی اختلاف ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ وہ واپس کیا جاتا کیونکہ جب اور سب صحیفے سوائے چار مستند صحیفوں کے جلائے گئے تو یہ کیوں نہ جلایا گیا اس کا نہ جلانا اس بات کی قطعی شہادت ہے کہ مصاحف عثمانی اور صحف ابوبکر میں کوئی فرق نہ تھا۔ علاوہ ازیں اگر ان دونوں میں کوئی فرق ہوتا تو یہ بھی ممکن نہ تھا کہ وہ بعد میں ظاہر نہ ہو جاتا اور اگر حضرت عثمان کی خلافت میں اس کے ظاہر ہونے میں کوئی دقت بھی تھی تو بہرحال حضرت علی کے وقت میں ایسا کوئی مانع نہ تھا۔ اور اس وقت بھی یہ اصل نسخہ موجود تھا اس وقت تو اسلام میں کئی فریق بھی ہو گئے تھے۔ پس اگر ایک فریق اس کا خواہاں نہ بھی ہوتا تو دوسرا ضرور ایسے اختلافات کو ظاہر کر دیتا۔ جن لوگوں نے حضرت عثمان کو قرآن شریف پڑھتے ہوئے شہید کر دیا تھا کیا ممکن تھا کہ اُن کے ہاتھ میں ایسے کسی اختلاف کا آنا ممکن ہوتا تو اسکو ظاہر کر کے خلیفہ کے خلاف الزام قایم نہ کرتے اور اس طرح پر لوگوں کی نظروں میں اپنے اس فعل کو جائز دکھانے کی کوشش نہ کرتے پس جس صورت میں ایک ذرہ بھر شہادت اس امر کی کسی روایت سے نہیں ملتی کہ صحف ابی بکر سے مصاحف عثمان کا کچھ اختلاف تھا۔ اور برخلاف اس کے صریح شہادت ملتی ہے کہ حضرت عثمان نے اسی اصل سے جو حضرت ابوبکر کے وقت میں تیار ہوا تھا اور اسی کاتب کی معرفت جس نے حضرت ابوبکر کے وقت میں صحف جمع کیا تھا چند نسخے لکھوائے تو یہ نتیجہ یقینی اور قطعی ہو جاتا ہے کہ حضرت عثمان والے مصاحف حرف بحرف نقل صحف ابی بکر کی تھے۔ اور اصل میں اور ان نسخوں میں جو حضرت عثمان نے لکھوائے کسی قسم کا فرق نہ تھا۔

حضرت عثمان کی کاروائی میں صحابہ شامل تھے

اگر حضرت عثمان کا یہ حکم کہ وہ تمام اوراق جن پر خود بخود لوگوں نے قرآن شریف لکھ لیا تھا جلا دیئے جائیں صحابہ کی نظر میں قابل اعتراض یا ناجائز ہوتا تو وہ کبھی اسکو گوارا نہ کرتے۔ حضرت عثمان کی طاقت تو خود صحابہ سے تھی پس اگر وہی مخالف ہوتے تو حضرت عثمان قطعاً ایسی کارروائی کرنے کی جرات نہ کر سکتے

تھے۔ بلکہ ایسی صورت میں ساری اسلامی دنیا اُن کے برخلاف اُٹھ کھڑی ہوتی۔ مگر معتبر روایت سے ثابت ہے کہ انہوں نے نہ صرف آپ کی اس کارروائی پر کوئی اعتراض ہی نہیں کیا بلکہ اس کو پسند کیا اور اس میں حضرت عثمان کو مدد بھی دی۔ اول محرک اس کے حذیفہ رضی اللہ عنہ تھے جو کہ آرمینیا سے اسی غرض سے آئے تھے اور جب حضرت عثمان کے سامنے یہ امر پیش ہوا تو پہلا کام جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ صحابہ کو جمع کر کے مشورہ لیا کہ اس معاملہ میں کیا کرنا چاہئے۔ چنانچہ ایک روایت جسے ابن داؤد نے بیان کیا ہے وہ یوں ہے: قال قال علی لا تقولوا فی عثمان الا خیرا فواللہ ما فعل الذی فعل فی المصاحف الا عن ملا منا قال ما تقولون فی ھذہ القرأۃ فقد بلغنی ان بعضھم یقول ان قرأتی خیر من قرأتک وھذا یکاد ان یکون کفرا قلنا فما تری قال اری ان نجمع الناس علی مصحف واحد فلا تکون فرقۃ واختلاف قلنا فنعم ما رایت یعنی ”حضرت علی نے کہا کہ عثمان کے حق میں سوائے کلمہ خیر کے کچھ نہ کہو کیونکہ مصاحف کے بارے میں جو انہوں نے کیا وہ ہمارے مشورہ سے ہی کیا۔ انہوں نے ہم سے دریافت کیا کہ تم اس قرات میں کیا کہتے ہو کیونکہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں میری قرات تمہاری قرات سے بہتر ہے۔ اور قریب ہے کہ ایسا کلمہ کفر کا ہو جائے۔ ہم نے کہا آپ کی کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا میری رائے یہ ہے کہ ہم لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کریں۔ تا کہ کوئی فرقہ اور اختلاف نہ رہے ہم نے جواب دیا کہ آپ کی رائے بہت اچھی ہے“۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے مشورہ کے بعد یہ کام کیا۔ ایک روایت کے بموجب بارہ آدمی اس مجلس میں شامل تھے جن کی سپرد قرآن شریف کے کئی نسخے لکھوانے کا کام کیا گیا تھا چنانچہ زید۔ سعید۔ اُبیؓ۔ انس بن مالک عبداللہ بن عباس وغیرہم کے ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف چار آدمی اس اہتمام پر تھے سا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً یہ کام چار صحابہ کے سپرد کیا گیا اور بعد میں اس تعداد کو بڑھا دیا گیا۔ جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ جتنے نسخے پہلے تیار کرانے کا خیال ہو بعد میں اُن سے زیادہ کی ضرورت محسوس ہوئی ہو عبداللہ بن مسعود ہی ایک ایسے شخص تھے جو علم قرآن میں مشہور ہونے کے باوجود اس مجلس میں شامل نہیں ہوئے لیکن اُن کو اس وجہ سے باہر نہ رکھا گیا تھا کہ ان کے خلاف کسی کو کوئی ضد یا تعصب تھا بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ اس وقت مدینہ میں موجود نہ تھے بلکہ بہت دور یعنی کوفہ میں رہتے تھے اگر اُن کو بلوایا جاتا اور اُن کا انتظار کیا جاتا تو کام میں بڑا التوا پڑتا۔ اس لئے کام کو جلدی کرنے کی خاطر ان کو شامل نہ کیا جا سکا مگر جیسا کہ صحابہ کے مشورہ سے یہ کام شروع ہوا تھا۔ ایسا ہی اس کی تکمیل پر اور حضرت عثمان کے اس حکم پر کہ باقی تمام اوراق کو جلا دیا جائے صحابہ نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔ چنانچہ

مصعب بن سعد کہتے ہیں کہ جب حضرت عثمان نے اوراق قرآن کریم کو جو خود بخود لوگوں نے نقل کر لئے تھے جلانے کا حکم دیا۔ تو میں بہت سے صحابیوں سے ملا مگر اُن میں سے کسی نے حضرت عثمان کے اس فعل پر اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ اسے پسند ہی کیا۔ اصل میں جیسا کہ کئی روایات سے معلوم ہوتا ہے حضرت عثمان کو زیادہ تر فکر اختلاف قرات سے نہیں ہؤا بلکہ اس بات سے کہ جو لوگ اختلاف قرات کی اصل وجہ سے ناواقف تھے انہوں نے ایسے اختلافات کو مباحثوں اور جھگڑوں کا ذریعہ بنا لیا۔ پس جب عثمان اور دیگر صحابہ نے یہ دیکھا کہ ایسے اختلافات فسادوں اور غلطیوں کا موجب ہو رہے ہیں اور جس ضرورت کے لئے ان کی اجازت دی گئی تھی وہ ضرورت باقی نہیں رہی تو انہوں نے مصلحت اس بات میں سمجھی کہ ان اختلافات کا دروازہ آیندہ بند کر دیا جائے

ابن مسعود کی عدم شمولیت

حضرت ابن مسعود جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اس کام میں شریک نہ ہو سکے اور تمام جماعت صحابہ میں سے ایک وہی شخص تھے جنہوں نے بعض روایات کے مطابق حضرت زید کے متعلق نازیبا الفاظ بولے اگرچہ یہ احادیث اعلیٰ طبقہ احادیث میں سے نہیں ہیں مگر تاہم ان پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ ابن مسعود جیسے صحابی نے حضرت عثمان سے اختلاف کیا۔ ایک روایت میں سے یہ ہے کہ ایک ایسے آدمی کو قرآن لکھنے پر مامور کیا گیا ہے جو ابھی ایک کافر باپ کی پیٹھ میں تھا جب کہ میں مسلمان ہو چکا تھا۔ الفاظ اس روایت کے جسے ترمذی نے نقل کیا ہے یہ ہیں۔ ان عبد اللہ بن مسعود کرہ لزید بن ثابت نسخ المصاحف وقال یا معشر المسلمین اعزل عن نسخ کتابۃ المصاحف ویتولاھا رجل واللہ لقد اسلمت وانہ لفی صلب رجل کافر۔ ان الفاظ سے مراد ابن مسعود کی یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ عمر میں اور اسلام میں زید بن ثابت پر تقدم رکھتے تھے۔ اب یا تو یہ روایت غلط ہے اور یا ابن مسعود نے غلطی کھائی اسلام میں تقدم یا عمر میں بڑے ہونا ایسے امور نہ تھے جو کتابت قرآن میں بھی فضیلت کو ثابت کر سکتے۔ اور اس لئے ان الفاظ سے کچھ مطلب نہیں نکلتا۔ مگر جب کتابت کے معاملہ میں فضیلت کو دیکھا جاتا ہے تو یہ یقیناً زید بن ثابت کو حاصل تھی۔ جب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے اور زید بن ثابت اسلام میں داخل ہوئے۔ کتابت وحی کا کام زیادہ تر انہی کے سپرد رہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عین حیات میں ہی وہ کاتب الوحی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب کتاب کی صورت میں قرآن شریف کو جمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما دونوں کی نظر زید بن ثابت پر ہی پڑی حالانکہ ابن مسعود بھی اس وقت وہیں موجود تھے اور حضرت ابوبکر اور عمر سے بڑھ کر کوئی شخص اس امر کو نہ سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ موزوں اس

کام کے لئے کون ہے۔ اگر واقعی ابن مسعود زید کو اس قابل نہ سمجھتے تھے تو یہ اعتراض تو انہیں حضرت ابوبکر کے وقت کرنا چاہئے تھا۔ جس وقت ایسا اہم کام جمع کا سا اُن کے سپرد کیا گیا تھا۔ مگر اس وقت انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یا تو یہ روایت ہی غلط ہے۔ اور یا ابن مسعود نے غلطی کی۔ زید بن ثابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں اور تمام صحابہ کی نظر میں اس کام میں سب پر سبقت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں حضرت عثمان کے وقت میں اول تو کام ہی محض اس قدر تھا کہ ایک اصل نسخہ سے دوسرے نسخے نقل کئے جائیں۔ اور دوم حضرت عثمان نے اس کام کو بھی بلا مشورہ نہیں کیا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے صحابہ سے دریافت کیا کہ من اکتب الناس تو انہوں نے جواب دیا کہ زید بن ثابت کاتب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اسی روایت کے اخیر میں ترمذی نے اسی راوی ابن شہاب سے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں۔ قال بلغنی انہ کرہ ذالک من مقالۃ عبد اللہ بن مسعود رجال من افاضل الصحابۃ یعنی "عبد اللہ بن مسعود کے ان الفاظ کو جو انہوں نے زید ثابت کے متعلق بولے اجلۂ صحابہ نے ناپسند کیا اور بُرا منایا" علاوہ ازیں ان روایات کی رو سے اگر عبد اللہ بن مسعود کو کوئی بات ناپسند تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ زید بن ثابت کو اس کام پر کیوں مامور کیا گیا ہے۔ اور مجھے مامور کیوں نہیں کیا گیا۔ حضرت عثمان پر انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ البتہ بعض روایات جو بہت کمزور ہیں اس قسم کی بھی آئی ہیں کہ عبد اللہ بن مسعود نے اپنا نسخہ قرآن حضرت عثمان کے آدمیوں کو دینے سے انکار کیا۔ اور پھر انہوں نے زبردستی اُن سے چھین لیا۔ مگر ان روایات پر یقین کرنے کے کافی وجوہات موجود نہیں ہیں۔ اور اگر بفرض محال ان روایات کو صحیح بھی مان لیا جائے تو ان سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ حضرت عثمان نے جو نسخے لکھوائے تھے وہ ناقص تھے یا صحیح نہ تھے ان سے اگر کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے تو صرف یہی کہ عبد اللہ بن مسعود جو بعض قرائتیں اپنے طور پر پڑھتے تھے اُن سے روکا جانے پر انہوں نے اظہار ناراضگی کیا اور اسی وجہ پر اپنے نسخہ قرآن کو دینے سے انکار کیا۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں باقی صحابہ نے کس کی تائید کی؟ کیا ایک آدمی کا نام بھی لیا جاسکتا ہے جس نے ابن مسعود کی رائے کی تائید کی ہو جس طرح ابن مسعود کھلے طور سے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے اور اس اظہار کی وجہ سے کسی نے اُن کو مار نہ ڈالا تھا اسی طرح دوسرے صحابہ بھی اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کر سکتے تھے۔ اور کوئی اُن کو روکنے والا نہ تھا۔ مگر سب صحابہ نے بالاتفاق حضرت عثمان کی کارروائی کو صحیح سمجھا۔ اور ابن مسعود کی تائید نہیں کی۔

ان تمام واقعات سے جو اوپر بیان ہوئے یہ امر نہایت صفائی کے ساتھ پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے

کہ جو مصاحف حضرت عثمان نے شایع کرائے وہ لفظ بلفظ اور حرف بحرف اس قرآن کریم کی نقل تھے جو حضرت ابوبکر نے جمع کرایا تھا جس کے متعلق ہم پہلے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ وہ بلا تفاوت ایک حرف کے وہی قرآن شریف تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو سکھایا تھا۔ جب حضرت عثمان نے مصاحف نقل کرا کر بھیجے تو اس وقت ہزار ہا صحابہ ابھی زندہ موجود تھے۔ اور بعض اُن میں سے جیسے عبداللہ بن عمر اور ابی بن کعب وغیرہما ایسے تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حین حیات اور آپکے سامنے کل قرآن شریف حفظ کر لیا تھا اور ہزار ہا آدمی ایسے تھے جنہوں نے آپ کے بعد قرآن شریف کو حفظ کر لیا تھا اب حضرت عثمان نے جو مصاحف لکھوائے اُن کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف تیرہ سال بعد ہے۔ اور اگر ان مصاحف میں اصل نسخہ سے یا قرآن شریف سے جیسا کہ حافظوں میں محفوظ تھا کچھ بھی اختلاف ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ صحابہ خاموشی سے ان مصاحف کو قبول کر لیتے۔ قرآن کریم ان کا سب سے بڑا قیمتی خزانہ تھا جسے وہ جانوں سے بھی عزیز رکھتے تھے۔ اور اگر ضرورت ہوتی تو پہلے اپنی جانوں کو قربان کر دیتے مگر یہ کبھی گوارا نہ کر سکتے تھے کہ قرآن شریف میں کوئی شخص کسی قسم کا تغیر تبدل کرے۔ ان میں صرف قرآن شریف کی اعلیٰ درجہ کی محبت اور اخلاص ہی موجود نہ تھا بلکہ اُنکے ہاتھ میں ایسے ذرائع موجود تھے جن سے وہ مصاحف عثمانی کی صحت کو پرکھ سکتے تھے۔ اگر کوئی فقرہ چھوڑ دیا جاتا یا کوئی حصہ جو قرآن میں داخل نہ تھا داخل کر دیا جاتا تو سینکڑوں صحابی اس کا تذکرہ کرتے مگر ابن مسعود تک نے بھی کبھی حضرت عثمان کے خلاف یہ الزام نہیں لگایا کہ آپنے کوئی حصہ قرآن شریف کا چھوڑ دیا ہے یا کچھ بڑھا دیا ہے۔ بلکہ اس کی شکایت صرف یہ تھی کہ اس کو بعض قرأتوں کے پڑھنے سے کیوں روکا گیا۔

اس تمام بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عثمان نے قرآن شریف میں کوئی تغیر نہیں کیا۔ بلکہ جیسا آپ کو جمع ابوبکر سے ملا ویسا ہی اُنہوں نے سب مسلمانوں تک پہنچایا۔ اُنہوں نے جو کارروائی کی وہ تمام صحابہ کے مشورہ سے تھی۔ اور پھر نقلیں کرنے کا اہتمام اُن صحابہ کے سپرد کیا گیا۔ جو اپنی قرآن دانی میں سب سے بڑھکر شہرت رکھتے تھے۔ پھر جو نسخے آپ نے لکھوا کر شایع کئے اُن کو تمام اسلامی دنیا نے صحیح نسخے قرآن شریف کے تسلیم کیا۔ اور اگر بفرض محال کوئی اختلاف نسخوں میں ہوتا بھی تو اس کا اثر قرآن کریم پر جیسا کہ وہ حافظوں میں محفوظ تھا کچھ نہ پڑ سکتا تھا حضرت عثمان کے سخت ترین دشمن جنہوں نے نہایت بے رحمی سے آپ کو قتل کیا انہوں نے بھی یہ الزام آپ پر نہیں لگایا کہ آپنے قرآن شریف میں کوئی کمی بیشی کر دی ہے۔ اگرچہ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک اعتراض انہوں نے

بنایا تھا کہ حضرت عثمان نے اُن کاغذات کو کیوں جلوایا جن پر قرآن شریف لکھا ہوا تھا۔ اگر کمزور سے کمزور اعتراض بھی مصاحف عثمانی کی صحت اور ترتیب پر ہوتے تو یقیناً دشمن اسے بڑھا چڑھا کر بیان کرنے سے کبھی نہ رکتے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت علی کی خلافت میں بھی کسی شخص نے حضرت عثمان پر اس بارہ میں کوئی الزام نہیں دیا۔

اخیری حصہ ہمارے دعوے کا جو قرآن شریف ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ بعینہٖ صحف عثمانی کی نقل ہے، یہ ایسا دعویٰ ہے جس کو سخت سے سخت دشمنان اسلام نے بھی تسلیم کیا ہے۔ پس قرآن کریم کا تمام تر حفاظت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک پہنچنا یقینی اور قطعی دلائل کے ساتھ ثابت ہے صحف ابوبکر میں وہ قرآن تحریر بہ تمام و کمال محفوظ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے اور حضرت عثمان کے مصاحف میں پوری احتیاط سے صحف ابی بکر سے نقلیں کرائی گئیں۔ اور پھر اُن سے آج تک تمام اسلامی دنیا میں قرآن شریف شایع ہوتے رہے یہی وجہ ہے کہ اگر دو ایسے ملکوں سے جن میں بعد المشرقین ہے دو نسخے قرآن کے لے لو تو اُن میں ایک زیر زبر یا ایک حرف یا لفظ کا فرق بھی نہ پاؤ گے۔ اگر حفاظت آلٰہی شامل حال نہ ہوتی تو اس قدر حفاظت انسانی طاقت میں نہ تھی۔ اب ہم اُن چند اعتراضات کا جواب دیں گے جو بعض حدیثوں کی بنا پر حفاظت قرآنی پر کئے جاتے ہیں۔ اور اس مضمون سے اصل مضمون حفاظت قرآن کریم کا مکمل ہو جائیگا۔

۶۔ اعتراضوں کے جواب

حفاظت قرآن کریم پر چھ قسم کے اعتراض

اگرچہ جس قدر شہادت پہلے پانچ عنوانوں کے نیچے دی جا چکی ہے وہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کہ قرآن کریم ہر ایک قسم کی تحریف اور تصرف سے محفوظ ہم تک پہنچا ہے اعلیٰ درجہ کی قطعی اور یقینی شہادت ہے اور کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ لیکن چونکہ اس سوال کے تمام پہلوؤں پر بحث کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اس لئے ذیل میں ہم اُن تمام اعتراضوں کو جو عیسائیوں نے قرآن کریم کے محفوظ ہونے پر کئے ہیں نقل کر کے اُن کا جواب دیتے ہیں۔ تا کہ کسی مخالف کو یہ کہنے کی گنجایش باقی نہ رہے کہ فلاں اعتراض کا جواب نہیں دیا گیا۔ جہاں تک میں نے مخالفین کی تحریروں پر غور کیا ہے مندرجہ ذیل اعتراضات پر زور دیا گیا ہے

۱۔ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ موجودہ قرآن شریف میں بعض فقرے ناقص اور ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اور کہ اصل میں وہ فقرے مکمل تھے۔ پس ضرور ہے کہ بعض حصے ضایع ہو گئے ہوں۔

۲۔ ایک اور اعتراض یہ ہے کہ حضرت عثمان نے قرآن کے بعض نسخوں کو جو بعض صحابہ کے پاس تھے

اور جن کی قراتیں حضرت عثمان والے صحیفہ سے مختلف تھیں تلف کرادیا یا اُن کی اشاعت کو روک دیا پس ان نسخوں کو تلف کرانے سے ضرور قرآن شریف کے کچھ حصے ضائع ہو گئے ہونگے۔

۳- ایک اعتراض یہ ہے کہ بعض حصوں کو ہمیشہ کے لئے قرآن شریف میں داخل کرنے کا منشاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ ہوگا یا نہ تھا۔ یا بعض حصے منسوخ ہو گئے ہونگے اور ممکن ہے کہ زید نے ان امور پر اطلاع نہ پانے کی وجہ سے اُن کو قرآن شریف میں داخل کر دیا ہو۔

۴- چوتھا اور بڑا بھاری اعتراض یہ سمجھا جاتا ہے کہ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بعض عبارتیں قرآن شریف میں پڑھی جاتی تھیں جو اب نہیں پڑھی جاتیں جس سے موجودہ قرآن کریم کے ناقص ہونے کا نتیجہ نکالا جاتا ہے۔

۵- پانچواں اعتراض یہ ہے کہ مسلمانوں میں بعض فرقے ایسے موجود ہیں (جس سے معترض کی مراد فرقہ شیعہ ہے) جو اس بات کو مانتے ہیں کہ قرآن شریف محفوظ نہیں رہا۔ بلکہ ناقص ہے اور اس میں سے بعض حصے نکال دیئے گئے ہیں۔

۶- تازہ ترین اعتراض ڈاکٹر منگانا نے اس صورت میں کیا ہے کہ اس کو بعض اوراق قدیم نسخہ جات قرآنی کے ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن سے موجودہ نسخہ جات سے کسی لفظ یا حرف کا اختلاف پایا جاتا ہے

بعض فقرات کے نامکمل ہونے کا اعتراض

مختلف مضامین کو پڑھ کر جو قرآن کریم کی جمع پر لکھے گئے ہیں میں نے یہ چند اعتراض مختصر الفاظ میں بطور خلاصہ اُن مضامین سے نکالے ہیں۔ اور اُن میں تازہ سے تازہ تصانیف جو اسلام کے خلاف لکھی گئی ہیں شامل ہیں اب ہم اسی ترتیب کیساتھ ان اعتراضوں کا ایک ایک کر کے جواب دینگے۔ اعتراض اول کا بڑا حامی ایک مضمون نویس ہے جس نے اسلام (محمڈنزم) پر انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں مضمون لکھا ہے یہ مضمون نویس لکھتا ہے کہ حضرت عثمان والے نسخے مکمل نہیں تھے کیونکہ ان میں بعض فقرے ایسے پائے جاتے ہیں جو کھلے طور پر ناقص اور ادھورے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ اُن عبارتوں کا کچھ حصہ جس سے ان کی تکمیل ہوتی تھی ضائع ہو گیا ہے۔ ایک طالب حق اور ایک سمجھدار انسان بڑی آسانی سے اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت کی اس مضبوط اور قطعیۃ الدلالت شہادت کے بالمقابل جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ایسا وہم کچھ بھی وقعت نہیں رکھتا بلکہ اس کو دعویٰ بلا دلیل کی ذیل میں رکھ کر رد کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ قرآن شریف کا کوئی فقرہ ایک شخص کی نظر میں ادھورا دکھائی دیتا ہے اس لئے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اصل فقرہ ضرور کچھ اور ہوگا۔ اور کچھ حصہ اس کا ضایع ہو گیا ہوگا۔ ہم تو تاریخی شہادت پیش کرتے ہیں کہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا وہ سب صحابہ نے حفظ کر لیا اور مردوں اور عورتوں نے اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا

اور اس کے جواب میں یہ وہم پیش کیا جاتا ہے۔ کہ چونکہ کسی صاحب کو کوئی فقرہ مکمل معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کچھ حصہ ضائع ہو گیا ہو گا۔ معتبر تاریخی شہادت کے خلاف ایسے توہمات کو پیش کرنا پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ اب یہ بھی ثابت ہے کہ جس وقت حضرت زید نے تحریری جمع کے کام کو شروع کیا تو آپ نے نہ صرف قرآن مجید کے حافظوں سے ہی مدد لی بلکہ ان تمام تحریروں کو بھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کی ہدایت سے لکھی گئی تھیں۔ جہاں جہاں وہ تھیں وہاں سے جمع کیا۔ اور اس طرح پر ہر ایک آیت اور ہر ایک لفظ کے متعلق پوری پوری تحقیقات کر کے اس کو صحیفوں میں لکھا۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ بعض فقرے ادھورے ہیں یہ خود مخالفین کی عربی زبان سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ جہاں کمال فصاحت و بلاغت کسی فقرہ میں پائی جاتی ہے اس کو بوجہ اپنی ناواقفیت کے وہ ادھورا کہہ دیتے ہیں۔ اور جہاں نہایت باریک اور گہرا تعلق آیات میں ہے وہ بوجہ ایک سطحی نظر سے اس کو دیکھنے کے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ان آیات میں کوئی ربط نہیں ہے۔ پھر ایسے ایسے توہمات کو جو ناواقفیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی تاریخی شہادت کے بالمقابل اعتراضوں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

پھر گویا اسی بات کی تائید میں کہ بعض فقرے ناقص پائے جاتے ہیں وہی مضمون نویس انسائیکلو پیڈیا میں لکھتا ہے کہ چند چھوٹے چھوٹے اور الگ الگ ٹکڑے اب تک ایسے پائے جاتے ہیں جو کہ اصل میں قرآن شریف کے حصے تھے مگر زید نے ان کو شامل نہیں کیا۔ اب ان احادیث پر مفصل بحث چوتھے نمبر کے اعتراض میں آئے گی یہاں میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اعتراض اول کے ساتھ اس کو چسپاں کرنے سے معترض کا منشا یہ ظاہر کرنے کا ہے کہ جو فقرے ناقص پائے جاتے ہیں انہیں کے ٹکڑے اب تک حدیثوں میں موجود چلے آتے ہیں۔ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ بعض فقرے جن کو معترضین ادھورے سمجھتے ہیں وہ ان ٹکڑوں کے ساتھ شامل کرنے سے جو ایسی حدیثوں میں پائے جاتے ہیں در حقیقت کامل ہو جاتے ہیں تو پھر یہ مضمون بھی قابل بحث ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اعتراضوں کی بنا صرف توہمات پر ہے اور کوئی مثال پیش نہیں کی جاتی کہ مثلاً قرآن شریف کا فلاں فقرہ ناقص ہے اور فلاں حدیث میں جو یہ کہا گیا ہے کہ فلاں عبارت کسی وقت قرآن شریف کا جزو تھی اگر اس عبارت کو اس ناقص فقرہ کے ساتھ ملا دیا جائے تو اُن کے ملنے سے ایک کامل فقرہ بن جاتا ہے۔ اگر ایسی کوئی مثال پیش کی جائے تو پھر اعتراض کی صورت بھی بنتی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ ٹکڑے جو احادیث میں بیان کئے گئے ہیں۔ اُن کے لئے کوئی ایسی جگہ قرآن شریف کے اندر نہیں ملتی کہ جہاں اس کو رکھا جا سکے۔ اور اسی سے ان ٹکڑوں کی اصل حقیقت کا پتہ لگتا ہے۔

بحیثیت مجموعی اعتراضات ایک دوسرے کے موائد نہیں ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اگران تمام اعتراضوں پر یکجائی نظر سے غور کیا جائے تو وہ خود ہی ایک دوسرے کا بطلان کرتے ہیں۔ بات یہ پیش کی جاتی ہے کہ قرآن شریف کے بعض حصّے گم ہو گئے۔ اور اس کی تائید میں یہ واقعات پیش کئے جاتے ہیں کہ حضرت عثمان نے سوائے ان صحیفوں کے جو اپنی نگرانی میں تیار کرائے تھے باقی تمام صحف قرآنی کو جلا دیا۔ اور ان کی نقلیں شایع نہ ہونے دیں۔ اور کہ بعض احادیث میں یہ ذکر ہے کہ بعض عبارتیں اصل میں قرآن شریف میں پائی جاتی تھیں۔ جواب اس میں داخل نہیں ہیں اور کہ بعض فقرے موجودہ قرآن میں ناقص ہیں۔ اور کہ شیعہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ بعض حصے جن میں حضرت علی کے فضائل کا ذکر تھا وہ قرآن سے نکال دیئے گئے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت عثمان نے مصحف تیار کرا کے اطراف میں بھیجے اور دوسرے نسخوں کو جلانے کا حکم دیا۔ تو اس کے بعد وہ اختلاف جو صحف عثمانی اور دیگر صحائف میں بتائے جاتے ہیں یا تو موجود رہے یا قطعاً نابود ہو گئے اگر ایسے اختلاف صحف عثمانی کی اشاعت سے قطعًا رک گئے تھے تو پھر وہ روایات جن میں یہ ذکر ہے کہ فلاں عبارت قرآن شریف میں داخل تھی بالکل غلط ثابت ہوتی ہے۔ اور اگر ایسے اختلاف بعد میں بھی کچھ نہ کچھ محفوظ چلے آئے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے نسخے قرآن کریم کے دنیا سے کیوں نابود ہو گئے۔ حضرت عثمان کی سلطنت میں اگر یہ ممکن نہ تھا تو اس کے بعد کون روکنے والا تھا جن لوگوں نے ان اختلافات کو نسلاً بعد نسلٍ محفوظ رکھا تھا کیوں کچھ وقت گذرنے کے بعد جب اسلام کی سلطنت منتفرق ہو گئی انہوں نے ان کو اپنے نسخوں میں درج نہ کر لیا۔ اور کون مانع ہوا۔ پھر ایک دوسری مشکل اس میں یہ پیش آتی ہے کہ اگر وہ حصص جن کو کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان نے چھوڑ دیا تھا محفوظ رہے یا کل نہیں تو ان میں سے بعض ہی محفوظ رہے تو چاہیئے تھا کہ وہ یا تو اعتراض نمبر اول اور یا اعتراض نمبر پنجم کے مطابق ہوتے۔ یعنی اُن سے یا تو فرضی نقص بعض فقرات کا دور ہوتا یا حضرت علی کی فضیلت ان میں پائی جاتی مگر تعجب یہ ہے کہ یہ عبارتیں جن کا ذکر احادیث میں ہے نہ تو فرضی نقص کو پورا کرتی ہیں نہ ہی حضرت علی کی فضیلت کی بو تک ان میں پائی جاتی ہے۔ جو حصص بزعم معترضین گم ہوئے تھے اُن کا تو نام و نشان تک نہیں ملتا اور جو حدیثوں میں عبارتیں پائی جاتی ہیں وہ گم شدہ حصص میں سے نہیں ہیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں اور اس سے ایک دانشمند آدمی ایک مفید نتیجہ پر نہیں پہنچتا؟ ایک چیز کے گم ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور اس کی تائید میں یہ پیش کیا جاتا ہے کہ فلاں جگہ سے وہ چیز یا اس کے اجزا برآمد ہو گئے ہیں۔ مگر جب اس برآمد شدہ مال کو دیکھا جاتا ہے تو یہ قطعًا اس مال کا کوئی حصہ ثابت نہیں ہوتا جس کے گم ہونے کا دعویٰ کیا گیا تھا پس اس دعوے کے بطلان پر یہی ایک دلیل کافی ہے پھر کیا یہ تعجب کی

بات نہیں کہ حضرت علی کی فضیلت کے بعض حصص قرآنی حضرت عثمان نے چھوڑے اور حضرت علی خود ہی حضرت عثمان کے بعد خلیفہ ہوئے۔ مگر وہ اپنی فضیلت کے حصص کو دوبارہ قرآن شریف میں درج نہ کر سکے پس تمام اعتراض خود ہی ایک دوسرے کی بیخ کنی کرنے والے ہیں۔ مگر مزید اطمینان کے لئے ان میں سے ہر ایک اعتراض پر الگ الگ بحث کر کے بھی ہم اُن کا جھوٹا ہونا دکھائیں گے۔

اب ہم دوسرے اعتراض کو لیتے ہیں حضرت عثمان نے یہ حکم دیا کہ سوائے ان اصلی صحف کے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں تیار ہوئے تھے اور ان مصحفوں کے جو ان صحف سے جو حضرت عثمان نے نقل کرائے تھے باقی نسخے قرآن شریف کے جلا دیئے جائیں اب ان مصحفوں میں سے جو جلائے گئے یعنی جن کے جلانے کا حکم دیا گیا دو مصحفوں کو صحف عثمانی کے بالمقابل معترضین خاص وقعت دیتے ہیں۔ یعنی حضرت ابن مسعود کا مصحف اور حضرت اُبی بن کعب کا مصحف ان مصحفوں اور عثمانی مصحفوں میں جو اختلاف بتایا جاتا ہے اس کے متعلق انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے مضمون نویس کی رائے اس قابل ہے کہ اُسے مخالفانہ نکتہ چینی کا بہترین وکیل سمجھا جائے۔ یہ وہی مضمون نویس ہے جس کے مضمون محمدؐ نام کا میں پہلے بھی حوالہ دے چکا ہوں۔ وہ لکھتا ہے "ساتھ ہی اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن شریف کی دوسری سورتیں فی الفور نابود نہیں ہوگئی تھیں خصوصیت سے ہمیں اُبی کے نسخے کے متعلق کچھ اطلاع ملتی ہے۔ جو فہرست اسکی سورتوں کی دی گئی ہے اگر وہ صحیح ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اُبی کے نسخہ میں بھی کچھ تھا جو موجودہ قرآنوں میں ہے اس صورت میں ماننا پڑتا ہے کہ اُبی کے مصحف کی بنا بھی انہیں اصل صحف پر ہوگی جو حضرت زید نے جمع کئے تھے۔ یہی بات ابن مسعود کے مصحف پر بھی صادق آتی ہے اور اسکی فہرست مضامین سے بھی جو ہم تک پہنچی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ لمبی سورتوں یعنی طوال کو پہلے رکھنے کے اصول پر ابن مسعود نے زید سے بھی بڑھ کر عمل کیا ہے۔ اس کے مصحف میں پہلی سورۃ یعنی فاتحہ اور ایک سو تیرہویں اور ایک سو چودھویں سورتیں یعنی معوذتین نہیں لکھی گئیں۔ اس کے برخلاف اُبی نے اپنے مصحف میں دو دعائیہ فقرے زیادہ لکھ رکھے تھے۔ جن کو ہم (حضرت) محمد (مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کے سمجھ سکتے ہیں یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس قسم کے اختلاف ہوئے ہونگے کہ آیا ایسے دعائیہ جملے قرآن شریف کا جزو ہیں یا نہیں۔ ان دونوں مصحفوں کی بعض قراتیں جو صحف عثمانی کی قراتوں سے مختلف ہیں محفوظ ہی ہیں اور قرآن کے پرانے اختلافات قرات کی بھی ایک بڑی تعداد محفوظ ہو کر ہم تک پہنچی ہے۔ ان میں سے ایک کثیر حصہ قرآنوں کا ایسا ہے جو موجودہ قراتوں سے بہت کم درجہ کا ہے۔ لیکن بعض قراتیں ایسی بھی ہیں جو مروجہ قرات کے ہم پلہ ہیں۔ اور چند ایک ایسی ہیں جن کو موجودہ قرات پر ترجیح دی جا

سکتی ہے"۔

مخالف کا اعتراف کہ مصحف عثمانی ہی اصل ہے

لیکن اس مضمون نویس کی صحیح صحیح رائے ناظرین کے سامنے پیش کرنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسی جگہ سے ایک اور فقرہ کا ترجمہ بھی ہدیہ ناظرین کیا جائے اس فقرہ میں جو منقولہ بالا فقرہ کے ساتھ ملحق ہے اور جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ وہ دلائل دیئے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل قرآن شریف وہی ہے جو عثمانی مصحفوں اور اُن کی نقلوں میں موجود ہے " صرف ایک ہی شخص ایسا معلوم ہوتا ہے جس نے واقعی طور پر حضرت عثمان کے مصحفوں کے جاری ہونے کے وقت کچھ مخالفت کی اور یہ ابن مسعود تھا۔ وہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سب سے پرانے رفیقوں میں سے تھا۔ اور بہت موقعوں پر اس نے آپ کی خدمات بھی کی تھیں لیکن اس کے خیالات کا دائرہ وسیع نہ تھا۔ اگرچہ وہ اسلامی مذہبی علم کلام میں ایک بڑا رکن مانا جاتا ہے۔ پر اُس کی مخالفت کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اب جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ اس وقت بہت سے ایسے مسلمان زندہ موجود تھے جنہوں نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے قرآن شریف سنا ہوا تھا اور پھر جب اس بات کو بھی دیکھتے ہیں کہ کمزور خلیفہ عثمان کی بعض دوسری تجاویز کی مذہب کے متعصب حامیان نے بڑی مخالفت کی اور کہ اُن لوگوں کا مخالفانہ جوش عثمان کے بعض حریص پرانے رفیقوں کے سبب سے اور بھی تیز ہو گیا۔ یہاں تک کہ آخر کار انہوں نے خلیفہ کو قتل کر دیا۔ اور بالآخر اس بات پر غور کرتے ہیں کہ خلیفہ کی موت کے بعد جو خانہ جنگیاں ہوئیں اُن میں مختلف فریق اس بات کی تلاش میں لگے رہتے تھے کہ کوئی ایسے وجوہ اُن کے ہاتھ میں آجائیں جن سے وہ اپنے مخالفین پر کفر کا فتویٰ لگا سکیں۔ جب ہم ان تمام باتوں پر غور کرتے ہیں تو اُن سے صاف طور پر مصحف عثمانی کے اصل قرآن ہونے کا نتیجہ نکلتا ہے۔ کیونکہ کسی فریق نے یہاں تک کہ حضرت علی کے فریق نے بھی اس معاملہ میں حضرت عثمان پر اعتراض نہیں کیا اور نہ اس مصحف کو چھوڑا جو زید نے تیار کیا تھا جو حضرت عثمان اور اُن کے خاندان کا مخلص تھا۔"

مجنون معترضین

میں نے یہ فقرے اس غرض سے نقل کئے ہیں تا کہ ناظرین خود اعتراض کی وقعت کو دیکھ سکیں اور معلوم کر سکیں کہ مخالفین اگر سوچ سمجھ کر چلیں تو موجودہ قرآن کے اصل قرآن ہونے پر کہاں تک اعتراض کر سکتے ہیں اس مضمون نویس کی رائے مخالف نکتہ چینی کو سنجیدگی سے بیان کرتی ہے اور اس لئے اس تردید سے ان تمام اعتراضوں کا قلع قمع ہو جاتا ہے جو معترضین نے کئے ہیں میرے خیال میں کیا انگریزی اور کیا اردو تحریروں کو جہاں تک پڑھا جائے اس سے با وقعت اعتراض کوئی معلوم نہیں ہوتا لیکن اس بات کا ظاہر کرنا بھی ضروری ہے کہ اسلام پر بعض دیسی عیسائی صاحبان نے

مجنونانہ اعتراض بھی کئے ہیں۔ ایسی ایک تحریر کی مثال مصنف تاویل القرآن میں بھی ملتی ہے۔ یہ شخص اپنی تاریخ قرآن کو ان الفاظ سے شروع کرتا ہے۔ "میری زندگی کے برسوں کے دن تھوڑے رہے اور بُرے" اور پھر تشریح دعویٰ کرتا ہوا لکھتا ہے کہ "اس امر کا کہ قرآن شریف کا کوئی بڑا حصہ ساقط ہو گیا اور جو بچ گیا وہ بدنظمی سے مرتب ہوا اکثر محققین کو اعتراف کرنا پڑا" اور پھر آخر پر لکھتا ہے کہ "جو قرآن اب ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے وہ اصل قرآن کا ایک ایڈیشن ہے۔ اس وقت اس سے زیادہ بہتر اور معتبر ایڈیشن بھی موجود تھے جیسے نسخہ ابوبکرؓ یا نسخہ عبداللہ بن مسعود یا نسخہ ابی بن کعبؓ یا نسخہ علیؓ یا اُن سب کے علاوہ کوئی اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے اہتمام سے جو نسخہ قرآن تیار ہوا تھا وہ حضرت عثمان کے نسخہ سے ضرور افضل تھا۔ گو ابن مسعود یا ابی بن کعب یا حضرت علی کے قرآنوں کی بحر کا نہ تھا۔ ہم بھی اُن سب مصاحف قرآن کی نسبت جو حضرت عثمان کے ہاتھوں شہید ہو گئے یہی کہتے ہیں کہ اگر آج وہ یا اُن کے نقول بھی ہم تک پہنچتے تو اُن سب سے بڑا ذخیرہ علم دین کا حاصل ہوتا ایسا کہ جس کے مقابل صحیفہ عثمانی دریا کے مقابل گڑھا متصور ہوتا" اور پھر ایک دوسری جگہ یہی شخص یوں بڑ ہانکتا ہے۔ "یہ بالکل مبالغہ نہیں کہ جو بےنظمی و بےاحتیاطی قرآن کے حق میں ابتداءً سرزد ہوئی دنیا میں کسی کتاب کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا گیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ گو وہ صحیفہ قرآن جو حضرت عثمان نے جمع کرایا ہم تک بے کم و کاست پہنچا۔ مگر وہ قرآن جو آنحضرت چھوڑ گئے گم ہو گیا۔ اور یہ جو باقی ہے صرف اس کی یادگار ہے کچھ بے ترتیب حصص جو اپنی قسمت سے بچ رہے" اور پھر ایک جگہ سبعۃ احرف کی بحث کرتا ہوا لکھتا ہے "پس ہم کو یہ ماننا پڑا کہ وہ قرآن جو حضرت پر نازل ہوا وہ ہفتگانہ قرآن تھا۔ اور لفظ قرآن کا اطلاق حقیقت میں اُن ساتوں حروف کے مجموعہ پر ہوتا تھا اور اب جو قرآن موجود ہے یعنی صحیفہ عثمانی وہ زیادہ سے زیادہ صرف کسی ایک حرف پر مشتمل ہے اور اس لئے اگر بہت رعایت کریں تو اس کو صرف ایک ساتواں حصہ سالم قرآن اصلی کا کہہ سکتے ہیں" ایسے شخص کا جواب صرف یہی کافی ہے کہ وہ معترضین جن کی مخالفت کی حالت اس مصنف کی طرح جنون کی حد تک نہیں پہنچ گئی وہ خود اس کے ان تمام لایعنی دعووں اور مجنونانہ بڑوں پر لعنت بھیجتے ہیں اور یہ گواہی دیتے ہیں جیسا کہ میور نے اور انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے مضمون نویس نے دی ہے کہ جس حفاظت سے قرآن کریم ہم تک پہنچا ہے اس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی اور کہ تمام واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اصل قرآن وہی ہے جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے اور جو مصحف عثمانی کی نقل ہے۔ اور کہ مصحف عثمانی ہی اصل قرآن تھا۔ اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی یا تغیر و تبدل نہیں ہوا۔

مصحف ابی اور ابن مسعود کی مطابقت مصحف عثمانی سے

اب ہم اصل اعتراض کی طرف واپس آتے ہیں۔ اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ ابن مسعود اور ابی بن کعب کے

صحف بلحاظ ترتیب اور بلحاظ عبارتوں کے عام طور پر مصحف عثمانی کے مطابق ہی تھے۔ اور یہ مطابقت یہاں تک تھی کہ راقم مضمون اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ ابن مسعود اور ابی نے اپنے مصحف ان صحف کی بنا پر تیار کئے تھے جو زید نے حضرت ابو بکر کے وقت میں جمع کئے تھے مگر اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ہی جمع ہو چکا تھا اور اسی بنا پر ابن مسعود یا ابی بن کعب یا زید کے مجموعے تیار ہوئے تھے یہی وجہ ان کی مطابقت کی تھی۔ کیونکہ وہ سب ایک ہی سرچشمہ سے لئے گئے تھے۔ ہاں فرق صرف اس قدر تھا کہ حضرت زید نے جو صحف میں قرآن شریف کو جمع کیا تو اس میں حد درجہ کی احتیاط سے کام لیا گیا۔ اور تمام اصل تحریریں اکٹھی کی گئیں۔ اور تمام صحابہ کے اتفاق اور مشورہ سے یہ جمع وقوع میں آئی لیکن ابن مسعود اور ابی بن کعب کی کوششیں صرف ذاتی تھیں۔ اس لئے اُن کا کسی موقعہ پر غلطی کھا جانا بھی ممکن تھا۔ بہر حال جو اختلاف ان صحفوں کے مصحف عثمانی سے بتائے جاتے ہیں وہ صرف دو قسم کے ہیں۔ یعنی اول یہ کہ ابن مسعود کے مصحف میں معوذتین اور فاتحہ قرآن کریم کے اندر نہ لکھی گئی تھیں اور اُبی کے مصحف میں دو دعائیہ فقرے زائد لکھے ہوئے تھے۔ اور دوم کچھ قراتوں کا اختلاف تھا۔ لہذا میں ان دو اختلافوں کی حقیقت پر غور کرونگا۔ اور تاویل القرآن کے مصنف کے بے سر و پا اور لایعنی دعوے اس قابل نہیں ہیں کہ اُن کی طرف توجہ بھی کی جائے اور خود اس کے ہم مذہبوں کی تحریریں اُسکے مجنونانہ دعووں پر نفرین بھیجتی ہیں۔ حضرت عثمان کے مصحف صرف صحف ابی بکر کی نقل تھے۔ اور نقل کرنیوالے بھی خود وہی حضرت زید تھے۔ جنہوں نے حضرت ابو بکر کے وقت صحف کو جمع کیا تھا۔ اور حضرت علی کے مصحف کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ بھی واقعات کے سامنے باطل ثابت ہوتا ہے۔ اگر حضرت علی کے پاس ایسا کوئی مصحف تھا تو کیوں کبھی اس کی اشاعت نہ ہوئی۔ بالفرض اگر حضرت عثمان مانع ہوئے تھے تو حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کیوقت میں کون مانع ہوا تھا۔ اور کم از کم یہ تو ضرور تھا کہ اگر اور کبھی موقع اس کی اشاعت کا نہ ملا تھا تو حضرت علی اپنی خلافت میں ہی اسکو شایع کرتے اور دنیا میں پھیلاتے اور عجیب تر یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت میں مصحف نقل کرانے میں خود حضرت علی بھی مددگار ہوتے اور اپنے مصحف کا نام تک نہ لیا۔

حدیثوں کے چار طبقے اور بعض تصانیف جلال الدین سیوطی

ہمارے سامنے اب اس اعتراض کے متعلق یہ سوالات حل طلب ہیں کیا ابی اور ابن مسعود کے پاس اپنے اپنے مصحف الگ تھے کیا اُن کا مصحف عثمانی سے کوئی اختلاف تعداد سور اور قراتوں میں تھا اور اگر تھا تو کس قدر پہلے ابی کو لو۔ کوئی معتبر روایت ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ ابی کا مصحف الگ تھا جس کا مروجہ قرآن سے اختلاف تھا یا یہ کہ اس مصحف میں علاوہ قرآن شریف کی ایک سو چودہ

سورتوں کے دو دعائیہ جملے اخیر پر لکھے ہوئے تھے۔ ہاں بعض روایات جلال الدین سیوطی کی اتقان میں ملتی ہیں۔ اور اس لئے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ سیوطی کی روایات پر ہم کہاں تک اعتبار کر سکتے ہیں اس کے لئے ہم ناظرین کو شاہ عبدالعزیز دہلوی کے عجالہ نافعہ کا حوالہ دیتا ہوں۔ جو اصول علم حدیث پر ایک مختصر سا مگر نہایت قیمتی رسالہ ہے۔ شاہ صاحب نے احادیث کو چار طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ طبقہ اول میں جو سب سے زیادہ معتبر ہے۔ وہ مؤطا امام مالک اور بخاری اور مسلم کو رکھتے ہیں۔ دوسرے طبقہ میں ابوداؤد و ترمذی و نسائی کو رکھا ہے۔ اور اُن کو بلحاظ اعتبار کے طبقہ اول سے کم درجہ کی تسلیم کیا گیا ہے تیسرے طبقہ میں ایسی کتابیں رکھی گئی ہیں جن کی عام طور پر قبولیت نہیں ہوئی۔ اور نہ ایسی احادیث کو محض ان کتابوں میں ذکر کیا جانے کی وجہ سے قابل سند مانا گیا ہے۔ بلکہ ان میں ایسی روایتیں بھی ہیں جن کے راویوں کے ثقہ ہونے پر اور ان کی راست گوئی پر بڑی جرح ہوئی ہے۔ اس طبقہ میں احادیث کی ایسی کتابیں جیسے طبرانی۔ طحاوی۔ بیہقی۔ مستدرک۔ حاکم۔ مسند ابن ماجہ۔ مسند دارمی اور چند کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سب سے آخری طبقہ احادیث کا چوتھا طبقہ ہے۔ جس کے متعلق شاہ صاحب یوں لکھتے ہیں

"طبقہ رابعہ احادیثے کہ نام و نشان آنہا در قرون سابقہ معلوم نبود و متاخران آنہارا روایت کردہ اند پس حال آنہا از دو شق خالی نیست یا سلف تفحص کردند و آنہارا اصلی نیافتہ اند تا مشغول بروایت آنہا مے شدند یا یافتند و در آنہا قدحے و علتے دیدند کہ باعث شد ہمہ آنہارا بر ترک روایت آنہا و علی کل تقدیر ایں احادیث قابل اعتماد نیستند و مایہ تصانیف شیخ جلال الدین سیوطی در رسایل و نوادر خود ہمیں کتب ہا ست" یعنی چوتھے درجہ کی حدیثیں وہ ہیں جنکا پہلے زمانوں میں کہیں نام و نشان بھی نہیں پایا جاتا اور متاخرین نے ہی ان کو روایت کیا ہے۔ پس ایسی حدیثیں دو حال سے خالی نہیں ہیں۔ یا تو پہلے لوگوں نے خوب تحقیق کی اور ان حدیثوں کو اصلی نہ پایا اس سے ان کی روایت نہ کی یا اگر انہوں نے انکو پایا تو انہیں ایسی قدح اور علت دیکھی کر جس کے سبب انہوں نے ان روایتوں کو چھوڑ دیا دونوں صورتوں میں یہ احادیث قابل اعتبار نہیں ہیں اور شیخ جلال الدین سیوطی کی تصنیفوں کی کل پونجی اپنے رسالوں اور نوادر میں اسی قسم کی کتابیں ہیں۔

پس اول تو اسی سے قیاس کر لینا چاہئے کہ اتقان کی روایات پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے یہ روایات محققین کے نزدیک بالکل ناقابل اعتبار ہیں اور یا تو محض وضعی ہیں یا ایسی کمزور اور ناقابل اعتبار کہ کسی محدث نے اُن کی روایت کو نہیں لیا۔ اب ایک اور امر قابل ذکر ہے۔ اور وہ یہ کہ نہ صرف ان روایات کو اعلیٰ طبقہ کی احادیث سے کچھ تائید نہیں ملتی بلکہ تردید ہوتی ہے۔ ہم دکھا چکے ہیں کہ روایات معتبرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابی بن کعب بھی اس مجلس میں تھے۔ جس کے سپرد حضرت عثمان

نے مصحفوں کا نقل کرانا کیا تھا بعض اور روایات ایسی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر کے وقت میں بھی ابی بن کعب نے جمع قرآن کے کام میں مدد دی۔ لیکن اگر بالفرض محال اس بات کو بھی تسلیم کرلیا جائے۔ کہ ابی کے پاس ایک الگ مصحف بھی تھا جس میں انہوں نے علاوہ قرآن شریف کی سورتوں کے دو دعائیہ جملے بھی لکھے ہوئے تھے تو اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ وہ دعائیہ جملے فی الواقع جزو قرآن شریف تھے۔ بلکہ اس سے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ کہ ابی بن کعب اُن کو قرآن شریف کی دو سورتیں سمجھتے تھے اور اگر ابی کا یہ خیال بھی ہو تو بھی اس سے قرآن کریم پر کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا۔ ہزارہا صحابہ کی متفقہ شہادت ایک طرف اور ابی کا خیال ایک طرف۔ قبل اس کے کہ ابی کے اس خیال کو مصحف عثمانی پر حملہ کرنے کے لئے پیش کیا جائے ان صحابہ کا نام تو معترضین کو لینا چاہئے جنہوں نے ابی کے اس خیال کی تائید کی۔ ابن مسعود جن کے خیالات بعض امور کی نسبت اجماع صحابہ سے الگ تھے۔ وہ بھی ابی کی تائید نہیں کرتے اور ان دو جملوں کو قرآن کریم کا جزو قرار نہیں دیتے اب اگر ایک شخص تحقیق کر کے اعتراض کرتا تو اسے یہ تو لازم تھا کہ پہلے وہ شہادت کا وزن کرتا اور پھر دیکھتا کہ آیا اعتراض کی صورت بھی بنتی ہے؟ قرآن کریم کوئی ایک یا دو شخصوں کی یادداشت نہیں کہ جو کچھ وہ کہہ دیں صحیح تسلیم کرلیا جائے۔ اور یہ خیال کرلیا جائے کہ باقی صحابہ کو کوئی علم ہی نہ تھا۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ صرف ایک ابی کو یہ معلوم ہوتا کہ فلاں دو دعائیہ جملے قرآن شریف کا جزو ہیں۔ اور باقی ہزارہا صحابی اس سے بالکل بے خبر رہتے اور اُن کے کانوں تک یہ بات ہی کبھی نہ پہنچتی۔ قرآن کریم کی ہر ایک آیت اس کے نزول کے وقت دشمنوں اور دوستوں کے درمیان کثرت سے شائع ہو جاتی تھی۔ اب ایک شخص سے غلطی بھی ہو سکتی تھی جس کی اصلاح ہزارہا دوسرے شخصوں کی شہادت سے ہو سکتی تھی بلکہ یہ ایک خصوصیت قرآن کریم کو حاصل ہے۔ کہ اس کی ہر ایک آیت ہزارہا لوگوں کے سینوں میں فی الفور محفوظ ہو جاتی تھی۔ اور اس طرح پر قرآن شریف کا محافظ کوئی فرد واحد نہ تھا۔ بلکہ ہزارہا محافظ تھے اور ایک آدمی کی غلطی کی اصلاح دوسروں کی شہادت سے فی الفور ہو سکتی تھی پس تمام صحابہ کی متفقہ شہادت ہی ایک ایسا امر ہے جو غلطی کرنے سے بچا سکتا ہے۔ اب اگر مصحف عثمان اور مصحف ابی میں کوئی اختلاف تھا تو اس کی صورت یہ نہ تھی کہ حضرت عثمان ایک بات کہتے ہیں۔ اور ابی اسکے خلاف کوئی دوسری بات کہتے ہوں۔ بلکہ یہ اختلاف ابی کا تمام جماعت صحابہ سے تھا حتیٰ کہ ابن مسعود سے بھی اختلاف تھا۔ پس ایسی صورت میں کسی معترض کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ کہ وہ یہ کہے کہ ممکن ہے کہ حق ابی کے ساتھ ہو یعنی ابی کی بات سچی ہو۔ کیونکہ ابی کی رائے اکیلی تھی اور اس کے خلاف تمام

صحابہ کی متفقہ شہادت تھی۔ پس جب کہ یہ بھی ثابت ہے کہ ہر ایک آیت نازل ہونے کے وقت عام طور پر شایع ہو جاتی تھی۔ اور دوسری طرف ابی کے خیال کا موید صحابہ میں سے ایک بھی نہیں ملتا۔ بلکہ وہ کھلے طور پر ابی کی بات کو غلط قرار دیتے ہیں تو یہ ماننا پڑیگا کہ ابی غلطی پر تھے۔ کیونکہ یہ تو قرین قیاس ہے کہ ایک شخص سے غلطی ہو جائے اور دوسرے اس کی اصلاح کر دیں۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ قرآن شریف کا کوئی حصہ نازل ہو اور اس کا علم سوائے ابی کے اور ایک صحابی کو بھی نہ ہو۔ یہ سب باتیں اس روایت کو جو اتقان میں موجود ہے قابل اعتبار فرض کر کے لکھی گئی ہیں۔ اور در اصل جیسا کہ میں دکھا چکا ہوں یہ روایت ہرگز قابل اعتبار نہیں ہے۔

حفد اور خلع

اب ہم ایک اور پہلو سے اس معاملہ پر نظر کرتے ہیں۔ اتقان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو جملے جنکو حفد اور خلع کی سورتوں کے نام سے نامزد کیا گیا ہے۔ دعائے قنوت کے دو حصے ہیں۔ اور اس طرح پر ہیں فقرہ اول اللھم انا نستعینك ونستغفرك ونثنی علیك الخیر ونخلع ونترك من یفجرك۔ فقرہ دوم اللھم ایاك نعبد ولك نصلی ونسجد والیك نسعی ونحفد ونرجو رحمتك ونخشی عذابك ان عذابك بالکفار ملحق۔ ترجمہ فقرہ اول کا یہ ہے۔ اے اللہ ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں اور تیری ہی حفاظت طلب کرتے ہیں۔ اور تیری نیک ثنا کرتے ہیں۔ اور جو شخص تیری نافرمانی کرتا ہے ہم اس سے بیزاری ظاہر کرتے اور اسے چھوڑتے ہیں۔ اور دوسرے فقرہ کا ترجمہ یہ ہے۔ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور تیرے لئے ہی نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے ہیں۔ اور تیری طرف ہی بھاگ کر آتے ہیں۔ اور تیری ہی خدمت کرتے ہیں۔ اور تیری رحمت کی امید کرتے ہیں۔ اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ تیرا عذاب کافروں کو جا لگتا ہے۔

دعائے قنوت قرآن کا حصہ نہیں

یہ وہی دعائے قنوت ہے جس کو مسلمان نماز میں پڑھتے ہیں اور یہ دعا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی ہے۔ دعائے قنوت کی اور بھی بعض صورتیں صحیح احادیث میں آئی ہیں۔ اور مندرجہ ذیل دعا بہت مشہور ہے۔ اللھم اھدنی فی من ھدیت وعافنی فی من عافیت وتولنی فی من تولیت وبارك لی فیما اعطیت وقنی شر ما قضیت فانك تقضی ولا یقضی علیك انہ لا یذل من والیت ولا یعز من عادیت تبارکت ربنا وتعالیت۔ مشکوۃ باب الوتر۔ اب یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ کہ دعائے قنوت کی یہ دونوں صورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں مروی ہیں اور قرآن کریم سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسلمانوں میں سے کیا سابقین اور کیا متاخرین سب دعائے قنوت کو پڑھتے رہے ہیں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا ان کو سکھائی تھی۔ پس

صحابہ کے علم کی حد صرف اسی بات تک نہ تھی کہ دعائیہ جملے جن کو ابی بموجب روایت اتقان اپنے مصحف میں شامل کرتے تھے۔ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی قرآن کا حصہ بنا کر نہیں سکھایا تھا۔ بلکہ اُن کو یہ بھی علم تھا کہ یہ دعائیہ جملے اُن کو سکھائے بھی گئے ہیں مگر ان کو جزو قرآن قرار نہیں دیا گیا اس طرح پر صحابہ کی شہادت برخلاف ابی کے صرف لاعلمی کی شہادت ہی نہ تھی کہ وہ کہتے ہوں ہمیں کبھی یہ جملے سکھائے ہی نہیں گئے۔ بلکہ اُن کی شہادت تو یہ تھی کہ یہ جملے تو ہمیں سکھائے گئے ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ قرآن کا جزو نہیں۔ اسی لئے صحابہ میں سے کسی نے ابی کی بات کی تائید نہیں کی۔ بلکہ احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس دعاء القنوت کو پڑھا اور اپنے صحابہ کو بھی سکھایا۔ مگر کبھی اس کو جزو قرآن نہیں کہا۔ ممکن ہے کہ ابی کو صرف اس بات سے غلطی لگی ہو کہ یہ جملے نماز میں پڑھے جاتے ہیں۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ اور بھی بہت سارے دعائیہ جملے نماز میں پڑھے جاتے تھے جو جزو قرآن نہیں تھے۔ اور یہ جملے بھی قرآن شریف کی آیات کی طرح فاتحہ کے بعد نہ پڑھے جاتے تھے اور نہ کبھی اس بات کو کافی سمجھا گیا کہ سورہ فاتحہ کے بعد آیات قرآنی پڑھنے کی بجائے انہی دو جملوں کو پڑھ لیا جائے پس اگر ابی نے ان دعائیہ جملوں کو مصحف میں لکھا یا قرآن کا حصہ سمجھا تو یہ محض اُن کا خیال تھا اور غلط خیال تھا۔ اور ہزارہا صحابہ کی قطعی شہادت اس کے خلاف بتاتی ہے کہ یہ جملے جزو قرآن ہرگز نہیں تھے کیونکہ اول تو حضرت ابوبکر کے وقت جمع قرآن میں کل صحابہ اس کام میں شامل تھے۔ اور وہ جمع کسی ایک آدھ آدمی کی رائے سے نہیں ہوئی۔ پھر جب حضرت عثمان نے اسی قرآن کریم سے نئے نسخے لکھوائے تو اس وقت بھی نقل کے اہتمام میں بہت سے صحابہ شامل تھے۔ علاوہ ازیں کسی صحابی سے کوئی روایت نہیں پائی جاتی۔ کہ یہ قرآن کا جزو ہیں۔ اور مصحف عثمانی میں یہ نقص رہ گیا ہے کہ ان کو داخل نہیں کیا گیا۔ بلکہ اگر ابی کا کوئی اختلاف تھا تو انہوں نے خود حضرت عثمان کے ساتھ انہی نقلوں کے اہتمام میں شامل ہو کر اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔ کیونکہ کہیں سے ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہو کہ یہ فقرے بھی مصحف کے اندر لکھنے چاہئیں۔ اور بموجب ایسی ہی روایات کے آخر اپنا مصحف جلا کر حضرت عثمان کے مصحف کی صحت کو قبول کیا میں نہیں سمجھتا اس سے بڑھ کر اور واضح تر شہادت قرآن کریم کی صحت کی کیا ہو سکتی ہے +

ابن مسعود کا اختلاف

اختلاف قرات کے سوال کو میں بالفعل چھوڑتا ہوں۔ کیونکہ یہ مضمون لمبا ہے۔ اور الگ عنوان کے نیچے اس پر آگے بحث آتی ہے۔ اب ہم ان اختلافات پر غور کرتے ہیں۔ جو ابن مسعود کی طرف منسوب کئے گئے ہیں یعنی یہ کہ وہ معوذتین کو اپنے مصحف میں نہ لکھتے تھے۔ اس کے متعلق بخاری میں حسب ذیل حدیث کتاب تفسیر میں آئی ہے عن زر قال سالت ابی بن کعب قلت ابا المنذر ان اخاک ابن مسعود یقول کذا وکذا

فقال ابی سالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لی قیل لی فقلت قال نحن نقول کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی کی دوسری روایت یوں ہے عن زر بن حبیش قال سالت ابی بن کعب عن المعوذتین فقال سالت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال قیل لی قلت فنحن نقول کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس روایت کے الفاظ میں کچھ ابہام ہے ترجمہ اس کا یوں ہے کہ زر کہتے ہیں میں نے ابی بن کعب سے پوچھا کہ ابن مسعود معوذتین کے بارہ میں ایسا ایسا کہتے ہیں انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا مجھے ایسا ہی کہا گیا ہے سو میں نے بتا دیا۔ انہوں نے کہا پس ہم وہی کہتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ابن مسعود معوذتین کے بارہ میں کیا کہتے تھے آیا واقعی اپنے مصحف میں نہ لکھتے تھے تو کس وجہ پر۔ کیونکہ ممکن ہے وہ اسے کلام الٰہی سمجھتے ہوں مگر یہ کہتے ہوں کہ اُن کا لکھنا قرآن شریف میں ثابت نہیں یا اور کچھ کہتے ہوں۔ بہر حال حدیث کے الفاظ میں تصریح نہیں۔ ہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواب ابی بن کعب نے یہ دیا کہ انہوں نے خود رسول اللہ علیہ وسلم سے معوذتین کے متعلق دریافت کیا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب کیا تھا یہ اسی سے معلوم ہو جائیگا۔ کہ ابی ان سورتوں کو قرآن شریف کا جزو سمجھتے اور مصحف میں لکھتے تھے۔ پس یہی جواب اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملا تھا۔ ظاہر الفاظ حدیث کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے یہ دونوں سورتیں اسی طرح وحی کی گئی ہیں۔ پس میں نے اس وحی کو لوگوں تک پہنچا دیا۔ مگر بعض دوسری روایات سے جو کم پایہ کی ہیں یعنی بلحاظ اعتبار کے وہ اس قابل نہیں کہ ہم ان کی صحت پر وثوق کر سکیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن مسعود اپنے مصحف میں ان سورتوں کو لکھتے نہ تھے۔ چنانچہ ایک روایت احمد کی ہے۔ ان عبد اللہ بن مسعود کان لا یکتب المعوذتین فی مصحفہ اور ایک اور روایت ان الفاظ میں ہے کان عبد اللہ بن مسعود یحک المعوذتین عن مصاحفہ ویقول انھما لیستا من کتاب اللہ یعنی عبد اللہ بن مسعود معوذتین کو اپنے مصاحف سے کھرچ ڈالتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ کتاب اللہ میں سے نہیں ہیں خود اتقان میں نووی اور ابن حزم کی شہادت موجود ہے کہ یہ ابن مسعود پر جھوٹ ہے لیکن اگر یہ روایت صحیح ہے تو معلوم ہوا کہ عبد اللہ ابن مسعود کا یہ خیال بعد کا تھا۔ کیونکہ وہ لکھے ہوئے کو کھرچتے تھے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ فعل اُن کا کسی علم کی بنا پر نہ تھا بلکہ اجتہاد کی بنا پر نہ تھا۔ بہر حال کسی دوسرے صحابی نے ان کے اس فعل کی تائید نہیں کی۔ جیسا کہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے قال البزاز لم یتابع ابن مسعود علی ذلک احد من الصحابۃ وقد صح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قراھما فی الصلوۃ

بزار کہتے ہیں کہ ایک بھی صحابی نے ابن مسعود کی اس بات میں پیروی نہیں کی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ نے معوذتین کو نماز میں پڑھا۔ صرف اسی قدر نہیں کہ دوسرے صحابہ نے ابن مسعود کی بات کی تائید نہیں کی۔ بلکہ خود ابی نے ہی اُن کی مخالفت کی اور اپنے علم کی بنا پر یہ فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو جزو قرآن ہی بتایا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ دو ہی آدمی ایسے بتائے جاتے ہیں۔ جن کے مصاحف میں کسی اختلاف کا ذکر بعض روایات میں موجود ہے۔ اور وہ دونوں ایسے ہیں کہ جو نہ صرف ایک دوسرے کی تائید نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کی مخالف ہیں ان کی رائے سب صحابہ کی رائے کے موافق ہے۔ اور مصحف عثمانی کو صحیح قرار دیتی ہے۔ ابی دعائے قنوت کو قرآن میں لکھتے ہیں تو ابن مسعود باقی صحابہ کے ساتھ انہیں غلطی پر قرار دیتے ہیں۔ ابن مسعود معوذتین کو قرآن میں نہیں لکھتے تو ابی دوسرے صحابہ کیساتھ انہیں غلطی پر قرار دیتے ہیں۔ پس ایک اکیلے آدمی کی رائے ہزارہا آدمیوں کی متفقہ شہادت کے خلاف جو علم کی بنا پر مبنی ہے کیا وقعت رکھتی ہے۔

معوذتین جزو قرآن ہیں

بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرت سے صحابہ صحیح علم اس بات کا رکھتے تھے۔ کہ معوذتین قرآن کریم کا حصہ ہیں اور یہ علم ان کا بلا واسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا۔ ابی کی شہادت کا ذکر اوپر ہو چکا۔ اور بھی بہت سے صحابیوں سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار ان سورتوں کو نماز میں پڑھا۔ دعائیہ جملوں کے طور پر نہیں بلکہ قرات کے طور پر یعنی بجائے کوئی اور حصہ قرآن کا پڑھنے کے انہیں سورتوں کو پڑھا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جو دعائیہ جملے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں پڑھا کرتے تھے جیسے دعائے قنوت وہ قرات کی بجائے نہ ہوتے تھے مگر معوذتین کو قرات کے طور پر پڑھا اور یہی صحابہ کو سکھایا چنانچہ کئی صحابیوں کی شہادت ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو ہدایت فرمائی کہ ان کو نماز میں پڑھا کرو۔ ایک صحابی سے روایت ہے ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم اقراہ المعوذتین وقال له اذا انت صلیت فاقرأ بھما اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ابن مسعود کو کیا غلطی لگی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ یہ دونوں سورتیں قل اعوذ برب سے شروع ہوتی ہیں۔ دوسری طرف قرآن شریف میں یہ حکم ہے اذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ یعنی جب تو قرآن شریف پڑھے تو اللہ کے نام کے ساتھ پناہ مانگ ادہر ان دونوں سورتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کس طرح پناہ مانگنی چاہئے۔ ابن مسعود نے یہ خیال کیا کہ اس کلام میں صرف وہ طریق سکھلایا گیا ہے جس طرح پناہ مانگنی چاہئے۔ یہ خیال ہی خیال نہیں بلکہ ایک روایت میں ابن مسعود کے یہ الفاظ موجود ہیں۔ انما امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یتعوذ بھما یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

یہ حکم دیا تھا کہ ان کے ساتھ پناہ مانگی جائے جس سے انہوں نے یہ خیال کرلیا کہ یہ قرآن کریم کا جزو نہیں۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگنے کا طریق سکھایا ہے۔ حالانکہ آنحضرت کے اس حکم کا کہ اُن کے ساتھ پناہ مانگی جائے یہ نتیجہ نہیں نکلتا تھا کہ وہ خدا کا کلام یعنی جزو قرآن نہیں ہیں۔ اس سے حضرت ابن مسعود کی غلطی کا صاف پتہ لگتا ہے۔ قاضی ابوبکر باقلانی نے ابن مسعود کے اس فعل کی تشریح یوں کی ہے اور اسی کی تائید قاضی عیاض نے بھی کی ہے۔ کہ ابن مسعود نے ان کے جزو قرآن ہونے سے انکار نہیں کیا۔ بلکہ صرف یہی کہا کہ ان کو قرآن کریم کے اندر نہ لکھا جائے جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ انہیں آنحضرت سے ان کا لکھنا ثابت نہ ہوا ہو خواہ کچھ ہی صورت ہو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابن مسعود کے اس خیال کی ایک بھی صحابی نے تائید نہیں کی اور اس لئے چونکہ صحابہ کی متفقہ شہادت اس کی رائے کے خلاف ہے۔ اس لئے تاریخی طور پر بھی ہمیں اس کے خیال کو قطعاً غلط ٹھہرانا پڑتا ہے۔ اور یہ اعتراض کہ وہ فاتحہ کو بھی اپنے مصحف میں نہ لکھتے تھے اس سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ کیونکہ کسی معتبر روایت سے اس کا کچھ بھی پتہ نہیں لگتا۔ صرف چوتھے طبقہ کی روایات میں جن کا ذکر اوپر ہوا ایک روایت اس بات کو بیان کرتی ہے جس کا ذکر جلال الدین سیوطی نے اتقان میں کیا ہے۔ اس روایت میں جو واقعہ ابن مسعود کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اگر وہ صحیح ہے تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سورۃ فاتحہ کو تمام قرآن کے لئے بطور خلاصہ سمجھا جاتا تھا۔ شاید اسی وجہ پر انہوں نے قرآن کے اندر اسے نہ لکھا ہو۔ یا وہ سمجھتے ہوں کہ جس طرح معوذتین صرف قرآن کے ختم کرنے کے لئے ہیں فاتحہ اس کے شروع کرنے کے لئے ہے۔ اور انہیں قرآن کے اندر لکھنے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال ایک آدمی کے محض خیال کو ہزارہا آدمیوں کی متفقہ شہادت کے خلاف جو وزن دیا جا سکتا ہے۔ وہی ابن مسعود کی ان باتوں کو صحابہ کے اتفاق کے مقابل دینا ہوگا۔

جمع زید میں کمی بیشی کے امکان کا خیال خلاف واقعات ہے

تیسرا اعتراض صرف ایک وہم ہی وہم ہے۔ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا تھا اسی کے مطابق آپ کاتبان وحی سے لکھواتے اور اسی کے مطابق حافظان قرآن حفظ کرتے۔ اگر جمع قرآن صرف تنہا زید کا ہی کام ہوتا اور اس میں دوسرے صحابہ ان کے معاون نہ ہوتے تو ایسے شکوک کے لئے جگہ مل سکتی کہ ممکن ہے زید سے بعض فقرات رہ گئے ہوں۔ یا بعض فقرات ایسے انہوں نے درج کر دیئے ہوں جن کو قرآن شریف میں شامل کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا نہ تھا لیکن جیسا کہ بہت سی روایات کی متفقہ شہادت سے جو مختلف سلسلہ رواۃ سے ہم کو پہنچی ہیں ثابت ہوتا ہے زید کے معاون جمع قرآن کے کام میں کل صحابہ تھے جنہوں نے قرآن شریف کو لکھا ہوا تھا۔ وہ اپنے اپنے لکھے ہوئے کاغذ لیکر حاضر

ہوئے۔ اور جنہوں نے حفظ کیا ہوا تھا اُن کے حافظوں سے مدد لی گئی۔ حضرت ابوبکر کے وقت میں بھی صحابہ کا جمع قرآن کے کام میں زید کے ساتھ شامل ہونا ثابت ہے اور حضرت عثمان کے وقت میں جب نسخے لکھے گئے۔ اس وقت بھی دیگر صحابہ کا زید کے ساتھ شامل ہونا ثابت ہے پس اس صورت میں جب کہ ابھی بہت سے لوگ اُن صحابہ میں سے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرآن شریف کو حفظ کر لیا تھا زندہ تھے۔ یہ بالکل ناممکن تھا کہ کچھ فقرات جو اصل میں قرآن شریف میں شامل تھے غلطی سے شامل ہونے سے رہ جاتے یا بعض فقرات ایسے شامل ہو جاتے جن کے شامل کرنے کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں دیا تھا۔ ایسی غلطی کا ارتکاب اکیلے آدمی سے ہو سکتا تھا مگر جہاں ایک طرف حفاظ موجود ہوں دوسری طرف کل کی کل تحریریں اکٹھی کی گئی ہوں۔ اور پھر وہ صحابہ جو دن رات آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم سے قرآن شریف سنتے تھے وہ موجود ہوں۔ وہاں ایسی غلطی کا ارتکاب ناممکن ہے۔ کیونکہ جو غلطی ایک شخص کرتا اس کی اصلاح دوسرے کر سکتے تھے۔ ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ ایک آدھ صحابی سے کوئی غلطی ہو سکتی تھی بلکہ ہم اس بات کو لکھ چکے ہیں کہ اگر ابی اور ابن مسعود کی مصاحف والی روایتیں درست ہیں تو ان بزرگوں سے بعض غلطیاں ہو جانے کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے اپنی ہی رائے کے مطابق سب کام کیا۔ مگر ہم جس بات پر زور دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ زید کی جمع اور پھر نسخ مصاحف کے وقت ایسی امکانی غلطیوں کی اصلاح کے اپنے بڑے ذرائع موجود تھے کہ غلطی کا امکان بھی باقی نہیں رہتا۔ چہ جائیکہ اُس کا وقوع ثابت ہو۔ زید نے بڑی محنت سے قرآن شریف کو جمع کیا جو کامل سورتیں نازل ہوئی تھیں اُن کو سورۃ سورۃ کر کے جمع کیا اور جہاں متفرق آیتیں نازل ہوئی تھیں۔ ایک ایک آیت کر کے انہیں تلاش کیا۔ اور پھر اُن تمام تحریروں پر تائیدی شہادت حافظانِ قرآن کی موجود تھی۔ اگر خالی تحریر کا ہی اعتبار کیا جاتا تو کہا جا سکتا تھا کہ کوئی آیت رہ گئی ہو گی مگر وہاں حافظ بھی سب جمع تھے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو سارا قرآن شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور آپکے سامنے حفظ کر چلے تھے۔ اور اس لئے زید خوب جانتے تھے کہ کس حصہ یا کس آیت کی تلاش ابھی کرنی چاہئے۔ چنانچہ جمع قرآن کے بارہ میں جو حدیث آئی ہے اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہاں زید کہتے ہیں فلاں آیت کو میں نے تلاش کیا یہاں تک کہ اسے فلاں شخص کے پاس پایا۔ یعنی آیت کا علم تھا اور تحریر کو تلاش کیا یہاں تک کہ تحریر بھی مل گئی پھر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ایک یا دو حافظوں پر ہی اعتبار نہیں کیا۔ بلکہ کل کے کل کو جمع کیا۔ ممکن تھا کہ ایک حافظ سے کہیں غلطی ہو جائے مگر اس کی اصلاح دوسرے فی الفور کر سکتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ایسی غلطی کی اصلاح کا دوسرا ذریعہ تحریر تھی۔ کیونکہ ہر ایک آیت بعد نزول فی الفور ضبط تحریر میں بھی

لائی جاتی تھی۔ یہ ایسا پختہ انتظام تھا کہ کسی غلطی کے امکان کو باقی نہیں چھوڑتا۔ کیونکہ باوجود ایک قسم کی قطعی شہادت کے موجود ہونے کے زید مطمئن نہ ہوتے تھے۔ جب تک کہ دوسری قسم کی شہادت نہ مل جائے حافظہ کی تائید تحریر سے اور تحریر کی حافظہ سے ہوتی تھی۔ اسی دوسری شہادت کی طرف حدیث جمع قرآن میں زید اشارہ کرتے ہیں۔ جب وہ یہ فرماتے ہیں کہ میں تحریروں اور آدمیوں کے سینوں سے قرآن شریف کو اکٹھا کرنے لگا۔ باقی رہا ناسخ منسوخ کا سوال اس کے جواب میں اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ اگر ہم اس بات کو فرض بھی کر لیں کہ کوئی آیت کبھی منسوخ کی گئی۔ تو صحابہ اس سے بے خبر نہ ہو سکتے تھے۔ کیونکہ جس چیز کو آپ نے منسوخ کرنا ضروری سمجھا ہو اس کا اعلان اور اس کی اشاعت بھی اسی طرح کی ہوگی جس طرح کسی آیت کے نزول کی۔ لیکن کسی آیت کے متعلق تمام ذخیرہ احادیث میں۔ ایک لفظ تک بھی موجود نہیں۔ کہ آنحضرت صلعم نے اسے منسوخ کیا ہو۔

قرآن میں کچھ بڑھایا گیا نہ کچھ گھٹایا گیا

اب ہم چوتھے اعتراض کی طرف آتے ہیں جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ بعض روایات میں اب تک قرآن کریم کے وہ فقرات محفوظ ہیں جو حضرت ابوبکر یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے وقت شامل نہیں کئے گئے۔ حالانکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں جزو قرآن سمجھے جاتے اور قرآن شریف میں پڑھے جاتے تھے۔ درحقیقت یہی اعتراض سب سے بڑا اعتراض ہے اور اس پر کسی قدر مفصل بحث درکار ہوگی۔ ہم اس بات سے تو انکار نہیں کرتے کہ ایسی روایات موجود ہیں۔ مگر یہ کہتے ہیں کہ وہ قابل اعتبار ہرگز نہیں ہاں بعض مقامات پر بعض الفاظ کے معنوں کی غلط فہمی کی وجہ سے بھی اعتراض پیدا ہوئے ہیں۔ قبل اس کے کہ ان روایات پر ہم ایک ایک کر کے بحث کریں - چند عام باتیں کرتے ہیں۔ جو امید ہے ناظرین کو اصل بحث کے سمجھنے میں مدد دیں گی۔ قرآن کریم کی حفاظت کو ثابت کرنے کے لئے ہمیں دو باتیں ثابت کرنی ہیں۔ اول یہ کہ قرآن شریف میں کوئی لفظ یا کوئی فقرہ بڑھایا نہیں گیا۔ اور دوم یہ کہ اصل میں سے کچھ چھوڑا نہیں گیا۔ جو موجودہ قرآن میں نہ ہو۔ ان میں سے امر اول کے متعلق یہ بات ثابت ہے کہ کوئی روایت معتبر یا غیر معتبر اصلی یا غیر اصلی ایسی نہیں پائی جاتی جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہو کہ فلاں آیت یا الفاظ جو اس وقت قرآن شریف میں پڑھے جاتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں نہ پڑھے جاتے تھے سوائے اس ایک روایت کے جس میں یہ ذکر ہے کہ ابن مسعود معوذتین کو مصحف کے اندر نہ لکھتے تھے یا لکھے ہوئے کو کھرچتے تھے۔ اس پر بحث گذر چکی ہے اور میں دکھا چکا ہوں کہ یہ ابن مسعود کی صریح غلطی تھی وہ اکیلے اس خیال میں پڑ گئے تھے۔ حالانکہ سارے کے سارے صحابہ حتیٰ کہ ابی بھی اس میں ان کی مخالفت کرتے تھے۔ غلطی کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ معوذتین صرف تعوذ کے لئے ہیں اور ان کو قرآن شریف کے خا

پر پڑھ لینا چاہئے ۔ قرآن شریف کے اندر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم جس سے ہر ایک سورۃ قرآن شریف کی شروع ہوتی ہے ، وہ صرف افتتاح کیلئے ہے اور جزو سورۃ نہیں ہے ۔ ایسا ہی خیال معوذتین کے متعلق ابن مسعود کا معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن اکیلے شخص کا خیال جو وہ بھی صریح طور پر واقعات کی غلط فہمی پر مبنی ہے ۔ تمام صحابہ کی متفقہ شہادت کے بالمقابل کیا وقعت رکھ سکتا ہے ، درآنحالیکہ ان کی شہادت کی بنیاد قطعی اور یقینی علم پر تھی نہ ابن مسعود کی طرح محض ایک خیال یا اجتہاد پر ۔ اس ایک روایت کے سوائے اور کوئی روایت ایسی نہیں جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہو کہ فلاں آیت یا سورۃ قرآن کریم میں شامل نہ تھی اور اس امر کی تو قطعاً کوئی شہادت نہیں کہ زید یا عثمان نے اپنی طرف سے کوئی آیت یا سورۃ ملا دی تھی ۔ اب جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرآن شریف میں کچھ بڑھایا نہیں گیا تو دوسری بات کا ثابت ہونا کہ اس میں سے کچھ گھٹایا نہیں گیا نہایت آسان ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ پہلے امر کا ثبوت بھی اس دوسرے امر کے ثبوت کا ممد ہے ۔ ہم پوچھتے ہیں کہ نہ بڑھانے کے وجوہات کیا ہوئے ۔ اگر قرآن شریف ایسی بے احتیاطی سے جمع کیا جاتا ۔ جیسا کہ مخالفین خیال کرتے ہیں کہ اس میں سے سورتوں کی سورتیں یا آیتیں رہ گئیں تو پھر اس بے احتیاطی کا اثر دوسرے پہلو پر بھی ہونا چاہئے یعنی جیسا کہ کچھ گھٹایا گیا تھا کچھ بڑھا بھی دیا جاتا تھا ۔ یا جیسے کچھ حصص رہ گئے تھے کچھ اور بھی داخل ہو جاتے کیونکہ دونوں طرف یکساں ہی اثر ہونا چاہئے تھا مگر چونکہ قرآن شریف میں بڑھ جانے کی شہادت کسی کمزور روایت سے بھی نہیں ملتی ۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت زید نے بڑے درجہ کی احتیاط اور تحقیق سے جمع کا کام کیا ۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ جس احتیاط اور تحقیق نے قرآن شریف میں کچھ زیادتی ہو جانے سے اس کلام پاک کو محفوظ رکھا وہی اس میں سے کم ہو جانے سے بھی اس کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ بن گئی ۔ اور اصل بات یہی ہے کہ حضرت زیدؓ نے اعلیٰ درجہ کی تحقیق کو کام میں لائے اور سامان حفاظت بھی سارے موجود تھے یعنی ایک طرف حافظان قرآن جنکو قرآن شریف کا ایک ایک حرف حفظ تھا اور دوسری طرف اصلی تحریریں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھیں ۔ پس ایک طرف سامان حفاظت کا پورا پورا موجود ہونا اور دوسری طرف حضرت زیدؓ کی اس قدر احتیاط ۔ یہی وہ بواعث تھے کہ جن کی وجہ سے قرآن شریف میں نہ کوئی زیادتی ہوئی اور نہ ہی کوئی کمی ہوئی ؛

نتائج کی بنیاد حدیث کی مجموعی شہادت پر رکھی جاسکتی ہے

دوسری بات جس کو میں خصوصیت سے بیان کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ حدیثوں سے استدلال کا طریق جو یورپین مصنف اختیار کر رہے ہیں بالکل غلط ہے ۔ یہ غلطی بعض مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہے ۔ یہ لوگ عموماً اپنے نتائج کی بنیاد حدیث کی مجموعی شہادت پر نہیں رکھتے ۔ بلکہ جہاں اعتراض کرنے کی غرض ہو یا پہلے دل میں کوئی خیال بیٹھا ہوا ہو تو ایک کمزور سے کمزور روایت بلکہ بعض وقت وضعی حدیث کو بنیاد ٹھیرا کر اس پر ایک عمارت

کھڑی کر دیتے ہیں۔ خواہ اس حدیث کے خلاف معتبر احادیث میں کتنی ہی وزنی شہادت کیوں موجود نہ ہو۔ اور خواہ وہ نتیجہ جو نکالا گیا ہے حدیث کی مجموعی شہادت کی رو سے کتنا ہی لغو ثابت ہوتا ہو اب جو ذخیرہ احادیث کا ہمارے سامنے موجود ہے اس میں ہر ایک قسم کی روایات شامل ہیں اور محدثین نے شاقہ محنتوں کے ساتھ معتبر اور غیر معتبر روایات کو الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے ایک محقق یا منقد کے لئے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ روایات کے ملے جلے ذخیرہ میں سے ایک روایت لیکر جو نتیجہ اس سے نکل سکے نکالے۔ بلکہ ایسا نتیجہ نکالنے سے پہلے اس کو کئی امور پر غور کرنا چاہئے۔ احادیث کے مجموعوں میں سے وہ مجموعہ جو امام بخاری نے جمع کیا، اور جو صحیح بخاری کے نام سے موسوم ہے سب سے زیادہ معتبر ہے اور جہاں احادیث سے متضاد شہادت ملتی ہو یعنی بعض احادیث کی شہادت بعض کے مخالف ہو تو مامون طریق ایسی صورت میں یہ ہے کہ بخاری کی حدیث کو مقدم کیا جائے۔ کیونکہ خود امت کا اجماع اس بات پر ہو گیا ہے کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری شریف ہے پس احادیث سے شہادت لیتے وقت پہلا قاعدہ جو ایک محقق یا منقد کو مدنظر رکھنا چاہئے یہ ہے کہ معتبر اور غیر معتبر احادیث میں فرق کیا جائے۔ بغیر اس قاعدہ کو مدنظر رکھنے کے ہم صحیح نتیجہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتے اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں ہم صرف اس صورت کا ذکر کر رہے ہیں۔ جب بعض احادیث سے بعض کے مخالف شہادت پیدا ہوتی ہو لیکن جہاں حدیث کا اختلاف قرآن سے ہو تو ایسی صورت میں حدیث کو رد کرنا پڑے گا۔ خواہ وہ کسی قسم کی ہو دوسرا قاعدہ جو احادیث کی شہادت کو وزن کرتے وقت مدنظر رکھنا چاہئے وہ یہ ہے۔ کہ جب احادیث ایک سی ہی معتبر یا غیر معتبر ہوں تو دیکھنا چاہئے کہ زیادہ شہادت کس طرف ہے مگر سب سے ضروری اور یقینی معیار یہ ہے کہ علمی تواتر کس بات کو صحیح ٹھیراتا ہے۔

اب ہم ان تینوں معیاروں کی رو سے ان احادیث کو پرکھیں گے۔ جو حفاظت قرآن کریم کے سوال کے متعلق ہیں۔ لیکن اس سے پہلے اُن احادیث کا بیان کرنا ضروری ہے جن پر اعتراضوں کی بنا رکھی گئی ہے ان احادیث کو میں تاویل القرآن سے لیتا ہوں۔ جو سخت معاندانہ رنگ میں لکھی گئی ہے۔ اور جس کے مصنف نے ایسی احادیث کے جمع کرنے میں سخت محنت اٹھائی ہے۔ اگرچہ اوپر میں نے یہ کہا تھا۔ کہ ہم اس کتاب کے مجنونانہ دعووں کی طرف کوئی توجہ نہ کریں گے لیکن تاہم اس مضمون میں ان تمام باتوں کا جواب دے دیا گیا ہے یا دیا جائے گا۔ جن کی بنا ایسے امور پر ہے جو روایات کی شہادت سے پیدا ہوں۔ خواہ ایسی روایات معتبر ہوں یا غیر معتبر روایات پیش کردہ یہ ہیں۔

وہ روایات جن میں یہ ذکر ہے کہ فلاں سورت یا آیت قرآن میں تھی اب نہیں ہے

(۱) صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ میں ابوالاسود سے یہ روایت ہے کہ ابوموسیٰ اشعری نے بصرہ میں حسب ذیل الفاظ قرا کی ایک جماعت کے سامنے بیان کئے انا کنا نقرأ سورۃ نشبھھا فی الطول والشدۃ ببراءۃ فانسیتھا

غیرانی قد حفظت منہا لوکان لابن ادم وادیان من مال ۔ لا بتغی وادیا ثالثا ۔ ولا یملاء جوف ابن ادم الا التراب ۔ وکنا نقرأ سورۃ کنا نشبہہا باحدی المسبحات فانسیتہا غیرانی قد حفظت منہا یایہا الذین امنوا لم تقولون مالا تفعلون فتکتب شہادۃ فی اعناقکم فتسئلون عنہا یوم القیمۃ

(۲) مسلم کتاب الرضاع میں حضرت عائشہ سے حسب ذیل روایت ہے۔ عن عائشۃ انہا قالت کان فیما انزل من القران عشر رضعات معلومات ثم نسخن بخمس معلومات فتوفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہی فیما یقرأ من القران۔

(۳) مسلم کتاب الحدود میں حسب ذیل روایت ہے۔ عن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما یقول قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ وھو جالس علی منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ بعث محمدا صلی اللہ علیہ وسلم بالحق وانزل علیہ الکتاب وکان مما انزل اللہ علیہ ایۃ الرجم قرأناھا ووعیناھا وعقلناھا ۔ فرجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجمنا بعدہ فاخشی ان طال بالناس زمان ان یقول قائل ما نجد الرجم فی کتاب اللہ تعالیٰ فیضلوا بترک فریضۃ انزلہا اللہ وان الرجم فی کتاب اللہ حق علی من زنا اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینۃ اوکان الحمل اوالاعتراف ۔ اور ایسا ہی سنن ابی داؤد کتاب الحدود باب الرجم میں یہ روایت ہے۔ عن عبد اللہ بن عباس ان عمر یعنی ابن الخطاب رضی اللہ تعالی عنہ خطب فقال فالرجم حق علی من زنا من الرجال والنساء اذا کان محصناً اذا قامت البینۃ اوکان حمل او اعتراف وایم اللہ لولا ان یقول الناس زاد عمر فی کتاب اللہ عزوجل لکتبتہا۔

(۴) عن عائشۃ قالت کانت سورۃ الاحزاب تقرأ فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مأتی ایات فلما کتب عثمان المصاحف لم نقدر منہا الا ماھو الان

(کتاب الاتقان جلد ۲ صفحہ ۳۰)

(۵) عن مالک ان اولہا لما سقط سقط معہ البسملۃ فقد ثبت انہا کانت تعدل البقرۃ لطولہا وفی مصحف ابن مسعود مائۃ واثنتا عشرۃ سورۃ لانہ لم یکتب المعوذتین وفی مصحف ابی ستۃ لانہ کتب فی اٰخر سورۃ الحفد والخلع (اتقان جلد اول صفحہ ۶۸)

یہ وہ پانچ روایات ہیں جن کی بنا پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ بعض آیات یا فقرے یا سورتیں جو آنحضرت

ان پانچ روایات کی تردید دوسری صحیح احادیث سے ہوتی ہے

صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں قرآن شریف میں پڑھی جاتی تھیں۔ اس وقت قرآن شریف میں موجود نہیں۔ اب پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا کوئی ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے ان روایات کی تردید ہوتی ہو اگر ایسی روایات ملتی ہوں تو پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہو گا کہ ان میں سے کونسی روایات زیادہ قابل اعتبار ہیں۔ شہادت کا وزن زیادہ تر کس طرف ہے اور علی تواتر اور مسلمہ واقعات تاریخی کونسی روایات کو صحیح ٹھیراتی ہیں۔ جیسا کہ ہم اس مضمون کے پہلے حصوں میں دکھا چکے ہیں۔ ایسی معتبر روایات بہت کثرت سے ملتی ہیں۔ جن سے ان روایات کے بیانات کی تردید ہوتی ہے۔ اس لئے اب ہم ان تین امور پر غور کریں گے جن کا ذکر ابھی ہوا۔ مگر قبل اس کے کہ ہم اس بحث کو چھیڑیں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ آخری دو روایتیں جو اتقان میں سے لی گئی ہیں اس قابل نہیں کہ ان پر کوئی توجہ کی جائے کیونکہ جیسا کہ شاہ عبدالعزیز نے اپنے عجالہ نافعہ میں جو اصول علم حدیث پر لکھا گیا ہے۔ یہ بتا دیا ہے جلال الدین سیوطی کی تصانیف میں ایسی روایات پائی جاتی ہیں۔ جن کا نام ونشان ابتدائی زمانہ میں نہیں ملتا۔ اور اس لئے ایسی روایات کسی طرح قابل اعتبار نہیں۔ پس اگر ان روایات کی تردید معتبر روایات سے نہ بھی ہوتی ہو تو بھی یہ اس قابل نہیں۔ کہ ان کی بنا پر کوئی اعتراض کیا جائے۔ بلکہ وہ خود اپنی تردید کے لئے آپ ہی کافی ہیں۔ اس طرح پر اتقان کی دونوں روایتوں کے رد کرنے کے بعد مسلم کی تین روایتیں رہ جاتی ہیں۔ پس اصول اول کے متعلق جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ سب سے پہلے ہم بخاری کو دیکھیں گے کہ آیا اس میں ایسی روایت پائی جاتی ہے جو مسلم کی ان روایات کی تردید کرتی ہو۔ کیونکہ صحیح بخاری وہ کتاب ہے جس کو بالاجماع اصح الکتب بعد کتاب اللہ مانا گیا ہے۔ اور مسلم یا کسی دوسری کتاب کو ایسا مرتبہ حاصل نہیں۔ پس اگر مسلم کی کوئی روایت یا کسی اور کتاب کی روایت بخاری کی تردید کرتی ہو۔ تو ہمیں ایسی روایت کو رد کرنا پڑے گا۔ لیکن ان روایات کی شہادت کی تردید نہ صرف بخاری سے ہی ہوتی ہے۔ بلکہ خود انہی کتابوں یعنی مسلم وغیرہ میں کثرت سے ایسی روایات پائی جاتی ہیں۔ جو ان تین روایتوں کی تردید کرتی ہیں۔ چونکہ حفاظت قرآن کے مضمون میں ہم ان احادیث کا مفصل ذکر اپنی اپنی جگہ کرتے آئے ہیں۔ اور انہی کی بنا پر ہم نے یہ قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لیکر آج تک محفوظ چلا آیا ہے۔ اور اس میں کوئی کمی بیشی یا تغیر و تبدل نہیں ہوا لہذا ان احادیث کے اعادہ کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔

حدیث ابو موسیٰ کے راویوں پر بحث

اب ہم ان تینوں کو ایک ایک کر کے لیتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ یہ کہاں تک قابل اعتبار ہیں۔ پہلی روایت ہیں ابو موسیٰ اشعری کے خطبہ کا ذکر ہے۔ جو اس نے قراء بصرہ کے سامنے دیا۔ اور جس کا ماحصل

یہ ہے۔ کہ وہ یعنی ابو موسیٰ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے صحابہؓ دو سورتیں پڑھا کرتے تھے جن میں سے اب صرف ایک ایک فقرہ ہی اسے یاد رہ گیا۔ اور پہلی سورۃ کے فقرہ کا مضمون یہ ہے۔ کہ اگر ابن آدم کے لئے مال کی دو وادیاں ہوتیں تو وہ ایک تیسری وادی کی تلاش کرتا۔ اور ابن آدم کے پیٹ کو سوائے مٹی کے کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ اور دوسری سورۃ کے فقرہ کا یہ مضمون ہے کہ اے ایمان دارو تم وہ بات کیوں کہتے ہو۔ جو کرتے نہیں اس کی شہادت تمہارے خلاف لکھی جائیگی اور قیامت کے دن تم سے اس کے متعلق باز پرس کی جائے گی خود مسلم سے جو بیرونی اور اندرونی شہادت اس روایت کے متعلق ملتی ہے۔ وہ اس کو مردود ٹھیراتی ہے۔ بیرونی شہادت کے لئے سب سے پہلے اس کے سلسلہ رواۃ کو دیکھنا چاہئے۔ اس روایت کے راویوں کے سلسلہ میں سب سے پہلے سوید بن سعید ہے۔ اور اس لئے سب سے پہلے ہم اسی کو لیتے ہیں کہ اس کی روایت کہاں تک قابل اعتبار ہو سکتی ہے راویوں کی جرح پر ذہبی کی میزان الاعتدال سب سے زیادہ معتبر کتاب ہے۔ اس کتاب میں سوید بن سعید کے متعلق یہ لکھا ہے۔ کہ بعض لوگوں نے جن میں مسلم بھی ہیں۔ اس کی روایت کو لیا ہے۔ لیکن اکثر نے اس کی روایت کو مردود سمجھا ہے۔ اور اس بات پر قریباً قریباً سب کا اتفاق ہے۔ کہ وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ اور آخر کار اندھا ہو گیا۔ اور اس وقت وہ بعض ایسی روایتیں بیان کر دیتا تھا جو در اصل اس کی روایتیں نہ تھیں۔ امام بخاری کے اس کے متعلق یہ الفاظ ہیں انہ ضعیف جداً۔ ایسا ہی ایک واقعہ کا اس کتاب میں ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا میلان شیعہ مذہب کی طرف تھا لکھا ہے کہ ایک شخص اس کے پاس کتاب الفضائل لایا تو اس نے علیؓ کو اول اور ابو بکرؓ کو آخر کر دیا۔ بہت سے لوگوں نے اسے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ اور بعض نے اس کو کذاب کہا ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ وہ متہم بالزندقہ ہے۔ یہ اس راوی کا حال ہے جس کے منہ سے مسلم نے اس حدیث کو لیا ہے۔ اور جب اس کی نسبت اس قدر بے اعتباری کی شہادت ملتی ہے تو ہمیں ضرورت نہیں کہ اب ہم اس حدیث کے دوسرے راویوں پر غور کریں۔

اس حدیث کے خلاف مسلم کی اپنی شہادت

ایک اور قسم کی خارجی شہادت خود مسلم سے ملتی ہے۔ جس سے روایت زیر بحث کی وقعت کچھ بھی نہیں رہتی۔ اس روایت سے پہلے خود مسلم نے اسی مضمون کی چار اور روایتیں نقل کی ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ سوید کی روایت سے جو الفاظ ابو موسیٰ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ ان کے متعلق یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ قرآن شریف کی دو سورتوں کے ٹکڑے تھے۔ لیکن ان چاروں روایتوں میں اس بات کا نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ مسلم کتاب الزکوٰۃ باب لو ان لابن آدم وادیین

لا یبتغی ثالثا ہیں سب سے پہلی روایت یہ ہے۔ حدثنا یحیی بن یحیی و سعید بن منصور و قتیبۃ بن سعید قال یحیی انا و قال الاخران ثنا ابو عوانۃ عن قتادۃ عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو کان لابن ادم وادیان من مال لا بتغی وادیا ثالثا و لا یملأ جوف ابن ادم الا التراب و یتوب اللہ علی من تاب یعنی یحیی بن یحیی اور سعید بن منصور اور قتیبہ بن سعید ان تینوں نے حضرت انس سے یہ روایت مسلم کو پہنچائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر آدمی کے لئے دو وادیاں بھی مال کی ہوتیں۔ تو بھی وہ تیسری کی خواہش کرتا۔ اور آدمی کے پیٹ کو سوائے مٹی کے کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ یعنی آخر موت سے ہی اس کی خواہشات اور حرص کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اور جو شخص خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ خدا بھی اس پر رجوع برحمت کرتا ہے اب اس روایت کے بموجب حضرت انسؓ یہ روایت کرتے ہیں کہ وہی لفظ یعنی لو کان لابن ادم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے تھے۔ اور ان کو قرآن کا جزو قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اب مسلم کی یہ دونوں روایتیں ایک دوسرے کے مخالف شہادت دیتی ہیں۔ یعنی ایک طرف تو سوید کی روایت جس کی رو سے لو کان لابن ادم الخ کو کسی بھولی ہوئی سورت کی آیت قرار دیا گیا ہے اور دوسری طرف یحیی بن یحیی اور سعید بن منصور اور قتیبۃ بن سعید تینوں کی متفقہ روایت ہے۔ جس کی رو سے انہی الفاظ کو قرآن شریف کا جزو نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے الفاظ قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ان دونوں روایتوں میں سے ہم زیادہ اعتبار کس پر کر سکتے ہیں۔ سوید کے متعلق جو رائے محدثین کی ہے۔ اس کو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ اب ان تینوں راویوں میں سے سعید بن منصور اور یحیی بن یحیی دونوں کو ذہبی نے میزان الاعتدال میں صریح الفاظ میں ثقہ بیان کیا ہے۔ اور تیسرے یعنی قتیبہ بن سعید کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا حال کچھ معلوم نہیں۔ بہر حال اس حدیث کی شہادت پہلی حدیث سے بہت بڑھ کر وزنی ہے کیونکہ وہاں تو صرف ایک آدمی کی روایت ہے اور وہ بھی ایسا جس کو اکثر محدثین نے ناقابل اعتبار اور ضعیف اور متروک الحدیث مانا ہے۔ اور بعض نے زندیق اور کذاب تک کہا۔ اور یہاں کم از کم دو ایسے راویوں کی شہادت ہے جن کو سب محدثین نے ثقہ تسلیم کیا ہے۔ اس لئے ہم آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ اس حدیث کی شہادت حدیث زیر بحث سے بہت زیادہ قابل اعتبار ہے۔ پس جب یہ حدیث قابل تسلیم ہے تو حدیث زیر بحث ضرور مردود ٹھہرتی ہے پھر اس کے علاوہ تین اور حدیثیں اسی مضمون کی مسلم نے بیان کی ہیں۔ اور ان سب میں ان الفاظ لو کان لابن ادم الخ

گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ کے الفاظ اور آپ کی حدیث قرار دیا گیا ہے۔ اور کسی ایک میں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ وہ جزو قرآن تھے۔ ان تین میں سے ایک حدیث میں ابن عباس کی طرف جو اس کے پہلے راوی ہیں یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں۔ فلا ادری من القرآن ھو ام لا یعنی میں نہیں جانتا کہ یہ قرآن کا جزو ہیں یا نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک دوسری روایت میں انہی الفاظ فلا ادری امن القرآن کے تعلق میں ابن عباس کا ذکر نہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی پچھلے راوی کے لفظ ہیں۔

ان تمام واقعات پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خود مسلم نے اس ایک روایت کے خلاف چار اور حدیثیں بیان کر کے اس کو ایک حد تک ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ اور کم از کم یہ تو ظاہر ہے کہ جب ایک ہی کتاب میں ہم پانچ روایتیں ایسی پاتے ہیں جن میں چار کی شہادت پانچویں کے مخالف ہے اور پھر ان چار روایتوں کو پانچویں روایت کی نسبت بلحاظ راویوں کے زیادہ قابل اعتبار بھی پاتے ہیں۔ تو ان چار روایتوں کی شہادت کے بالمقابل پانچویں روایت کی شہادت کو رد کرنا پڑے گا۔ اس بارہ میں یہ امر بھی قابل تذکرہ ہے کہ خود مسلم نے ان چار روایتوں کو پہلے اور اس پانچویں روایت کو جو ان کے مخالف ہے سب سے اخیر بیان کر کے یہ جتا دیا ہے کہ یہ روایت اُن کے مقابل بہت کم وزن رکھتی ہے یہ صرف قیاس ہی قیاس نہیں بلکہ مسلم نے صحیح مسلم کے دیباچہ میں خود اس بات کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ کہ جن حدیثوں کو اس نے زیادہ قابل اعتبار سمجھا ہے۔ اُن کا ذکر بھی پہلے کیا ہے۔ اور جن حدیثوں کو کمزور سمجھا ہے اُن کا ذکر بعد میں کیا ہے۔ چنانچہ اُنکے اپنے الفاظ یہ ہیں۔ فاما القسم الاول فانا نتوخی ان نقدم الاخبار التی ھی اسلم من العیوب من غیرھا وانقی من ان یکون ناقلوھا اھل استقامۃ فی الحدیث واتقان لما نقلوا۔ لم یوجد فی روایتھم اختلاف شدید ولا تخلیط فاحش کما قد عثر فیہ علی کثیر من المحدثین وبان ذٰلک فی حدیثھم فانا نحن تقصینا اخبار ھذا الصنف من الناس اتبعناھا اخبارًا یقع فی اسانیدھا بعض من لیس بالموصوف بالحفظ والاتقان کالصنف المقدم قبلھم یعنی امام مسلم کہتے ہیں کہ ہم نے اس قاعدہ کی پیروی کی ہے کہ ان حدیثوں کو پہلے رکھیں جو دوسری حدیثوں کی نسبت عیبوں سے زیادہ محفوظ ہیں۔ اور ان کے نقل کرنیوالے حدیث میں اہل استقامت اور اہل اتقان ہیں۔ ان باتوں میں جن کو انہوں نے نقل کیا اور اُنکی روایت میں اختلاف شدید یا بڑا خلط نہیں پایا جاتا جیسا کہ اکثر محدثین کو ان پر اطلاع ہوئی ہے۔ اور پھر لکھتے ہیں کہ جب ہم اس قسم کی حدیثوں کو بیان کر چکتے ہیں۔ تو اُن کے بعد اس قسم کی حدیثیں لاتے ہیں۔

جن کی سندوں میں بعض ایسے راوی بھی ہیں جو حفظ اور اتقان میں پہلے راویوں کی طرح نہیں۔ ان الفاظ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود مسلم نے حدیث زیر بحث کو وہ وقعت نہیں دی جو ان حدیثوں کو جن سے اس کے مخالف شہادت پیدا ہوتی ہے۔

روایت ابو موسیٰ پر اندرونی شہادت

روایت زیر بحث کے بطلان کو اور بھی واضح کرنے کے لئے اب ہم اس اندرونی شہادت پر غور کرتے ہیں جو خود اس روایت سے پیدا ہوتی ہے۔ اول تو خود اس فقرہ کی عبارت اس طرز کی ہے کہ کوئی شخص جس نے قرآن شریف کو پڑھا ہے اُسے قرآن شریف کا جزو قرار نہیں دے سکتا۔ ثانیاً وہ الفاظ جو ابو موسیٰ اشعری کی طرف منسوب کئے گئے ہیں اس روایت کے جھوٹا ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کنا نقرأ سورۃً یعنی ہم ایک سورۃ پڑھا کرتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کے مطابق وہ اکیلے ہی ایسے آدمی نہ تھے جن کو وہ سورۃ حفظ یاد ہو۔ بلکہ اُن کی طرح دوسرے صحابہ کو بھی یاد تھی۔ اس لئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ سورۃ تمام صحابہ میں شہرت رکھتی تھی۔ اب اگر اس بات کو فرض کر لیا جائے۔ کہ یہ ممکن تھا۔ کہ ابو موسیٰ اشعری ساری سورۃ کو یکایک بھول جائیں اور صرف ایک ہی فقرہ اُن کو یاد رہ جائے۔ تو یہ کیونکر ہوا کہ باقی تمام صحابی بھی اس کو ساتھ ہی بھول گئے کوئی صحابی نہ اس سورۃ کا ذکر کرتا ہے۔ نہ نام لیتا ہے۔ کہ کبھی کوئی ایسی سورۃ قرآن شریف کا ایک حصہ تھی۔ نہ ہی کسی صحابی نے اور انہی میں ابو موسیٰ اشعری بھی شامل ہے۔ حضرت ابوبکر کے وقت میں جب قرآن شریف جمع کیا جا رہا تھا زید کو یہ اطلاع دی کہ ایسی کوئی سورت بھی قرآن شریف میں داخل ہے۔ حالانکہ اس وقت عام طور پر اعلان کیا گیا۔ کہ جس شخص کے پاس کوئی حصہ قرآن کا ہو جو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا ہو وہ اسے لے آوے پھر نہ معلوم اس وقت ابو موسیٰ اشعری اور دوسرے صحابہ جن کو یہ سورۃ حفظ تھی کہاں تھے۔ یا کیوں انہوں نے اسے پیش نہ کیا۔ ایسا ہی حضرت عثمان کے وقت میں جب مصاحف کی نقل بڑے اہتمام سے کرائی گئی اس وقت بھی کسی کی اطلاع میں یہ بات نہ آئی کہ ایسی کوئی سورۃ بھی قرآن شریف میں ہے۔ پھر حضرت ابوبکر کے وقت سے لیکر جب قرآن شریف جمع کیا گیا کسی قاری نے یا حافظ نے باوجود اس کے کہ صحابہ میں بہت سے لوگ ایسے موجود تھے کبھی اس بات کو پیش نہ کیا۔ کہ جو قرآن شریف حضرت ابوبکر نے جمع کرایا تھا۔ اس میں ایک اتنی بڑی لمبی سورت کا نام و نشان تک پایا نہیں جاتا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ابو موسیٰ اشعری اور دوسرے تمام صحابہ جن کو سورۃ حفظ تھی اور ایسا ہی تمام حافظان قرآن اس سورت کو حضرت ابوبکر کی جمع سے پہلے ہی بھول چکے تھے۔ اور تمام تحریریں بھی جن پر یہ سورت لکھی ہوئی تھی۔ اس وقت سے پہلے تلف ہو چکی تھیں تو کم از کم اتنا تو ہونا

کہ یہ چند لفظ جو ابو موسیٰ اشعری کو یاد رہ گئے یعنی لو کان لابن اٰدم وادیان من مال الخ قرآن شریف میں درج کر دیئے جاتے۔ ابو موسیٰ اشعری صحابہ کو یاد دلاتے کہ ہم سب فلاں سورۃ پڑھا کرتے تھے جسکو اب ہم سب بھول گئے ہیں۔ اور یہی ایک فقرہ یاد رہ گیا ہے۔ تو ضرور تھا کہ صحابہ کو بھی یہ بات یاد آتی اور عجیب بات یہ ہے۔ کہ ابن مسعود اور ابی کے پاس جو کہا جاتا ہے کہ الگ نسخے قرآن شریف کے تھے۔ ان میں بھی اس سورۃ کا نام و نشان نہیں۔ پھر جب ابو موسیٰ نے اس بات کو بیان کیا تو اس وقت بھی ہزارہا صحابیوں میں کسی ایک نے بھی اس کی تائید نہ کی۔ اور تعجب پر تعجب یہ کہ وہ لوگ جو ایک ایک حدیث کے لئے مہینوں کے سفر کرتے اور محنت شاقہ اٹھاتے اُن میں سے بھی کوئی ایک اس تحقیق کے درپے نہ ہوُا۔ کہ اتنی بڑی لمبی سورتیں قرآن شریف کی جو کہ ابو موسیٰ کو بھول گئی تھیں اُن کا کہیں پتہ لگاتا۔ بلکہ خود ابو موسیٰ نے بھی کوشش نہ کی کہ جو سورتیں ان کو بھول گئی تھیں اُن کو تازہ کرنے کے لئے کچھ محنت اٹھاتے۔ اصل بات یہ ہے کہ روایت میں جو بات بیان کی گئی ہے وہ ایسی لغو اور دور از قیاس ہے کہ ایک سمجھدار آدمی ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر یقین نہیں کر سکتا۔ پس خارجی اور اندرونی شہادت دونوں نہایت صفائی سے اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ روایت زیر بحث سراسر جھوٹی ہے اور اس کی صداقت پر ایک ذرہ بھر بھی شہادت نہیں ملتی۔ اور یہ امر کہ مسلم نے اس روایت کو اپنی کتاب میں لکھ دیا ہے یہ کوئی اس کی صداقت کی شہادت نہیں۔ درآنحالیکہ ہم یہ بھی دکھا چکے ہیں۔ کہ خود مسلم بھی اس کو بہت ضعیف اور کمزور سمجھتا تھا اور دوسری حدیثوں کو جن سے اس کے مخالف شہادت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بہت زیادہ قابل اعتبار سمجھتا تھا۔

حضرت عائشہ کی روایت رضاع پر بحث

باقی دو روائتیں جو مسلم نے بیان کی ہیں۔ اور جن کو اعتراض کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر ان میں سے ہر ایک پر ایسی ہی لمبی بحث کی جائے تو یہ مضمون بہت طول پکڑ جائیگا۔ ہم نے صرف مثال کے طور پر یہ بتا دیا ہے کہ ایسی روایت پر خواہ وہ مسلم میں ہی موجود ہوں اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور تحقیق سے ایسی حدیثیں بالکل جھوٹی ثابت ہوتی ہیں پس باقی ماندہ دو روایتوں کے متعلق ہم صرف اُن کی اندرونی شہادت کے متعلق ہی مختصر طور پر کچھ ذکر کریں گے۔ ان میں سے ایک روایت کا جو نمبر ۲ پر دی گئی ہے۔ یہ مضمون ہے کہ حضرت عائشہ ؓ نے یہ بیان کیا تھا کہ قرآن شریف میں ایک آیت تھی جس میں صراحت سے یہ ذکر تھا کہ دس بار دودھ چوسنے سے حرمت رضاعی ثابت ہوتی ہے اور کہ یہ حکم بعد میں منسوخ ہو گیا۔ اور اس کی بجائے ایک اور حکم نازل ہوُا جس میں دس بار کی بجائے پانچ بار کا دودھ چوسنا حرمت رضاعی کے لئے کافی سمجھا گیا۔ اور کہ یہ آخری حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک قرآن شریف

میں پڑھا جاتا تھا۔ جو کچھ اس روایت میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسا حکم حضرت عائشہ کے سوا دوسروں کو بھی معلوم تھا۔ اور وہ اس کو قرآن شریف میں پڑھا کرتے تھے۔ درحقیقت اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر کوئی ایسا حکم نازل ہوتا تو اس کی شہرت عام ہوتی۔ کیونکہ یہ حکم ایسا تھا جو روزمرہ استعمال میں آنے والا تھا۔ عرب میں بچّوں کو عموماً دودھ دایہ سے پلایا جاتا تھا۔ پس اگر ایسی کوئی آیت قرآن شریف میں نازل ہوتی تو اس کا علم کبھی ایک شخص تک محدود نہ رہ سکتا تھا بلکہ اس کی اطلاع اور شہرت عام ہونی چاہئے تھی۔ محدثین نے یہ اصول قایم کیا ہے۔ کہ اگر کسی حدیث میں کسی ایسے واقعہ کا تذکرہ ہو جس کی اطلاع اور شہرت عام ہونی چاہئے۔ مگر وہ لوگ جن کو اس کا علم ہونا چاہئے تھا اس کے متعلق کچھ اطلاع نہ دیں۔ اور اس سے لاعلمی ظاہر کریں تو ایسی حدیث کے وضعی ہونے کی یہ شہادت کافی ہے۔ درحقیقت اگر غور کیا جائے تو یہ اصول نہایت معقول ہے جب ہم اس کے رو سے روایت زیر بحث کو پرکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت اصلی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایسا حکم رضاعت کے متعلق عام طور پر لوگوں کے علم میں آنا چاہئے تھا اور ضروری تھا کہ کثرت سے روایات اس کے متعلق ہوتیں روایت میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ایک آیت عام طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پڑھی جاتی تھی۔ اب جب حضرت ابوبکرؓ نے قرآن شریف کو جمع کرنا شروع کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف چھ ماہ کا عرصہ گذرا تھا مگر باوجود اس کے کہ اسقدر تھوڑا عرصہ گذرا تھا ایک شخص نے بھی حضرت ابوبکر یا زید کو اطلاع نہ دی کہ ایسی کوئی آیت بھی قرآن شریف میں ہے۔ بلکہ حضرت عائشہ نے بھی جن کی طرف یہ روایت منسوب کی جاتی ہے ایسی اطلاع نہیں دی اور بالفرض اگر وہ زید کو اطلاع نہ دے سکتی تھیں تو کیا اپنے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی نہ دے سکتی تھیں پھر حضرت عثمان کے وقت میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زندہ تھیں۔ مگر اسوقت بھی ایسی کسی آیت کا اُنہوں نے ذکر نہیں کیا۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ عمرہ کو تو کئی سال بعد حضرت عائشہ ایسی بات کا پتہ بتائیں لیکن خود اپنے والد کو جمع قرآن کے وقت نہ بتائیں۔ اور اس وقت جب کہ عام اعلان کیا گیا تھا کہ جس شخص کے پاس کوئی آیت ہے وہ اسے لے آئے خاموشی اختیار کریں۔ اور پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ حضرت عائشہ کے سوا کوئی شخص ایسی آیت کا نام تک نہیں لیتا۔ علاوہ اس کے جیسا کہ پچھلی روایت کی بحث میں دکھایا جا چکا ہے۔ خود مسلم کے اسی باب کی دیگر روایات سے اس روایت کے جھوٹا ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ کیونکہ ان روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی صحابی کو ایسی کسی آیت کی کوئی خبر نہ تھی۔ بلکہ اسی باب میں ایسی احادیث خود حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابیوں سے مروی ہیں۔ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کئے گئے ہیں۔

کہ کتنی دفعہ کی رضاعت سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ اگر ایسی کوئی صاف آیت قرآن شریف میں وارد ہوتی کہ پانچ یا دس دفعہ دودھ چوسنے سے حرمت قطعی ہو جاتی ہے۔ تو ایسے سوالات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیوں پوچھے جاتے۔ نہ ہی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ انہی سوالوں کے وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کا کوئی تذکرہ حدیث میں نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ اگر ایسا واقعہ ہوتا تو اس کا تذکرہ حدیث میں بھی ضرور ہوتا۔

حضرت عمر کی روایت رجم

رہی تیسری روایت سو اس کا بھی اب اس جگہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات غور کے قابل ہے کہ اگر اس روایت کے وہی معنی صحیح ہوں جو مخالف معترض کھینچ تان کر بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو جو الفاظ حضرت عمر کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ وہ اُن کی زبان سے نکلے ہوئے کبھی ثابت نہیں ہو سکتے۔ حضرت عمر کے الفاظ سے معترض یہی نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ گویا حضرت عمر اور دوسرے صحابہ کو ایک ایسی آیت یاد تھی جس میں زانی مردوں اور عورتوں کی سزا کا ذکر تھا۔ لیکن یہ آیت قرآن میں درج نہیں ہوئی۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا تھا کہ یہ آیت پڑھی جاتی اور یاد کی جاتی تھی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اور اُن کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین اس پر عمل کرتے اور اُس کے مطابق حکم کیا کرتے تھے۔ اب اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کہ ہم اس بات کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت عمر کا جمع قرآن میں سب سے بڑا دخل تھا۔ اور جمع شدہ قرآن شریف ان کی خلافت کے زمانہ میں اُن کے قبضہ میں ہی تھا۔ تو پھر کیا وجہ پیدا ہوئی کہ انہوں نے اس بات کو درج نہ فرمایا؟ اس آیت کے متعلق صرف تین قیاس کئے جا سکتے ہیں۔ (۱) یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ کا اس پر اتفاق تھا کہ یہ قرآن شریف کی آیت ہے (۲) یا یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی یہ رائے تھی کہ یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے اور دوسرے صحابہ اس سے متفق نہ تھے (۳) یا یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نہ حضرت عمرؓ اور نہ دوسرے صحابہؓ ہی اس کے آیت قرآنی ہونے پر متفق تھے۔ ان قیاسات میں سے صرف پہلا قیاس ہی ایسا ہے جس سے معترضین کی نکتہ چینی کو کچھ رونق مل سکتی ہے۔ لیکن اگر ایسا ہی ہوتا کہ حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ کرام اس بات پر متفق ہوتے کہ یہ قرآن شریف کی آیت ہے تو اُن کو کس بات نے روکا تھا کہ اسے جزو قرآن نہ کیا؟ اس لئے یہ قیاس بالکل باطل ٹھیرتا ہے اور خصوصاً جب اُن لوگوں کے اخلاص اور دیانت و امانت اور تقویٰ اور طہارت کیطرف توجہ کی جاتی ہے اور اُن کے اس دخل پر غور کی جاتی ہے جو جمع قرآن میں اُن کو حاصل تھا۔ اور نیز جب اس بات کو دیکھا جاتا ہے کہ اس حکم کے اخفا سے اُن کا کوئی ذاتی فائدہ نہ تھا تو ایسی حالتوں کے باوجود

اس کا درج قرآن ہونا اس قیاس کے بطلان پر قوی دلیل ہے +

اسی طرح دوسرا قیاس بھی غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس بات کی کہیں ذرا بھی شہادت نہیں ملتی کہ کبھی حضرت عمرؓ نے ایسا بیان کیا ہو اور صحابہؓ نے اُن کی تردید کی ہو اور اگر بالفرض یہ مانا جائے کہ واقعی طور پر حضرت عمرؓ کے ایسے بیان کی دوسرے صحابیوں نے تردید کی تھی تو حضرت عمرؓ جب کسی دوسرے صحابی کو اپنا موید نہ پاتے تو خود ہی اپنی غلطی سے رجوع کرتے۔ ان دونوں قیاسوں کے بطلان کے بعد صرف تیسرا قیاس ہی ایسا ہے جس پر یہ مقدمہ ٹھیر سکتا ہے۔ لیکن اسجگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ قیاس اس روایت کے ساتھ کس طرح توافق کھا سکتا ہے۔ کیونکہ ظاہر میں دونوں متضاد بیانات کی طرح نظر آتے ہیں مگر اصل بات یوں نہیں۔ تھوڑا سا غور کرنے سے یہ امر ظاہر ہو جائیگا کہ اگر اس روایت کے معنی تیسرے قیاس کے ساتھ متوافق نہ ہوں تو یہ روایت ہی بے معنی اور عبث ٹھیر جاتی ہے حضرت عمرؓ کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب کچھ زمانہ گذر جائیگا تو لوگ یہ کہنا شروع کردیں گے کہ زانیوں کو سنگسار کرنے کا حکم کتاب اللہ موجود نہیں حالانکہ زانی مردوں اور زانیہ عورتوں کو سنگسار کرنے کا حکم کتاب میں صحیح طور پر موجود ہے۔ اگر کتاب اللہ سے مراد قرآن شریف سمجھا جائے تو یہ ایک صریح تضاد ہے اور اس لئے حدیث مذکور سراسر بے معنی ہے کیونکہ پھر معنی یہ ہونگے کہ سنگساری کا حکم قرآن شریف میں موجود ہے مگر مرور زمانہ کے بعد لوگ کہنے لگیں گے کہ ایسا حکم قرآن شریف میں نہیں لیکن لفظ کتاب اللہ جو اس حدیث میں وارد ہے اگر اس کے مفہوم کو ذرا وسعت دی جائے تو یہ اختلاف دور ہو جاتا ہے سو واضح رہے کہ یہ ضروری نہیں کہ کتاب اللہ سے مراد قرآن ہی ہو کیونکہ یہی لفظ قرآن شریف میں بھی آیا ہے اور وہاں اس کے معنی احکام الٰہی کے ہیں۔ چنانچہ والمحصنت من النساء الا ما ملکت ایمانکم کتاب اللہ علیکم میں "کتاب اللہ" کے معنی قرآن شریف نہیں بلکہ احکام الٰہی ہیں۔ سو ان معنوں کی رو سے روایت کے معنی درست ہو جاتے ہیں اور قرآن شریف کی حفاظت پر جو اعتراض بنایا گیا تھا۔ دور ہو جاتا ہے۔ مگر یہ صرف اس صورت میں ہے کہ روایت کو صحیح تسلیم کیا جائے جو میرے نزدیک نہیں۔

ایسی روایات کس طرح مروج ہوئیں

بعض نکتہ چین لوگ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ ایسی وضعی روایات کا مسلمانوں میں کیونکر رواج ہو گیا اور کیونکر اُن کو مشہور و معروف جامعان احادیث نے اپنی کتب میں درج کر لیا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حدیثیں اسلام میں لاکھوں تک مروج ہوئیں اور اُن میں بہت سی بناوٹی اور موضوع حدیثیں بھی تھیں بہت سی ایسی احادیث زندیقوں نے وضع کیں جو بظاہر اسلام کے قایل مگر درپردہ دشمن تھے۔ اور بعض شیعوں نے بھی بعد میں بہت سی روایات بنالیں۔ چنانچہ انہیں میں سے ایک روایت کے راوی اول

کے حالات سے ظاہر ہو چکا ہے کہ وہ زندیق قرار دیا گیا تھا اور اس کا میلان رفض کی طرف پایا جاتا تھا لیکن امام مسلم نے اسکی روایت پر اگرچہ بہت اعتبار تو نہ کیا لیکن قبولیت میں جگہ دے دی۔ اس کی غالب وجہ یہ تھی کہ جس وقت امام مسلم رح نے اس روایت کو نقل کیا تھا۔ اس وقت اس شخص کے دل کے اندرونی خیالات دیکھے نہیں گئے تھے۔ اس میں کلام نہیں کہ محدثین نے صحیح اور وضعی حدیثوں کے پرکھنے اور اُن کے الگ کرنے میں بڑی سعی کی لیکن آخر وہ انسان ہی تھے عالم الغیب نہ تھے۔ جہاں تک انسانی عقل پہنچ کر کوشش کرتی ہے انہوں نے اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر بشری نقصانوں سے وہ کیونکر بچ سکتے تھے۔ غرض ایسی وضعی احادیث جن میں اسلام پر باریک رنگ میں حملے کیے گئے زندیقوں نے وضع کر کے اُن کو شہرت دی اور اس طرح مسلمانوں میں وہ رواج پا گئیں اور رواج پاکر معتبر شمار ہونے لگ گئیں علاوہ ازیں اس قسم کی وضعی حدیثوں کے بنانے اور رواج دینے میں بعض غالی شیعوں کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے پہل تو یہ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حقوق خلافت کو فوقیت اور ترجیح دیتے تھے لیکن جب اُن کے سامنے یہ بات پیش کی گئی کہ اُن کے اس دعوے کی تائید میں کوئی آیت قرآنی نہیں تو پھر انہوں نے خلفائے ثلاثہ کو کوسنا شروع کیا۔ اور اُن پر جھوٹا الزام لگانا شروع کیا۔ کہ انہوں نے جان بوجھ کر وہ آیات قرآن میں درج نہیں کیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حقوق کی موید تھیں۔ اس عقیدے کو رواج دینے کے لیے اس قسم کی روایتیں بنائی گئیں جن سے قرآن کریم میں نقصان کا واقع ہونا معلوم ہوتا اسی سے یہ استدلال ہو سکے کہ جب نقصان ہو گیا ہے تو ضرور ہے کہ بعض حصص جن میں حضرت علی کی فضیلت تھی نکال دیے گئے ہوں اور ممکن ہے کہ کسی جامع حدیث نے ایسی باتوں کو صرف اس پر محمول کر لیا ہو کہ یہ آیتیں منسوخ ہو چکی تھیں۔ لیکن اس سے اُن آیات کا قرآن شریف میں سے منسوخ ہونے یا فروگذاشت سے نہ لکھے جانے کا ثبوت نہیں ملتا۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ محققین اہل تشیع قرآن کریم کی حفاظت کے قائل ہیں۔ جیسے آگے دکھایا گیا ہے۔

ایسی سب روایات صرف اکیلے آدمی کی شہادت بیان کرتی ہیں

اگر بفرض محال ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ روایات زیر بحث معتبر ہیں تو اس صورت ہم کو اس بات کا دیکھنا ضروری ہوگا کہ آیا کوئی شہادت ان کے متعارض اور مخالف تو موجود نہیں کیونکہ اگر ایسی متعارض اور مخالف شہادت موجود ثابت ہوگی تو پھر اس بات کے جانچنے کی ضرورت ہوگی کہ دونوں میں سے کس طرف کی شہادت زیادہ قابل وثوق و اعتبار ہے اس موقعہ پر جب ہم دیکھتے ہیں تو ایک طرف تو اکیلے ابو موسیٰ اشعری کی گواہی ہے کہ دو سورتیں صحابہ پڑھا کرتے تھے اور جس وقت اس نے یہ حال

بیان کیا تو اس وقت اس کو یاد نہ رہی تھیں اور دوسری طرف ساری جماعت صحابہ کبار کی گواہی ہے
کہ اُن کے علم میں کسی ایسی سورۃ کا وجود کبھی نہیں ہوُا۔ جو جو لوگ قرآن خواں تھے اور جن جن کے پاس
قرآن شریف موجود تھا اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ جس نے اتنا بھی کہا ہو کہ ہم نے ایسی دو سورتوں
کی بابت سنا ہی تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ایک ابوموسیٰ اشعری کی گواہی اتنی بڑی معتبر جماعت صحابہؓ
کی شہادت کے مقابلہ میں کیا وقعت رکھ سکتی ہے۔ اور خصوصاً جب کہ یہ معاملہ ایسا تھا کہ اگر اس کا
کچھ بھی وجود ہوتا تو کثیر جماعت کے علم میں اس کا آنا ضروری تھا۔ ایسی صورت میں اکیلے شخص کی گواہی
کو تمام صحابیوں کی گواہی پر کوئی ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ بلکہ ترجیح کا سوال تو الگ رہا شمار اور موازنہ
میں بھی نہیں لائی جا سکتی البتہ اگر اس کے ساتھ بہت نہیں تو دو تین صحابہ ہی متفق ہوتے تو کسی منقد
کے دل میں شک پیدا ہونے کی وجہ ہو سکتی تھی لیکن یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو صرف ایک معمولی درجہ کی
خبر رکھنے والے صحابی کی شہادت پر مبنی ہے اور ہزارہا صحابہؓ رسول کریم صلعم جو اس سے زیادہ خبر اور دخل
اور حافظہ رکھنے والے تھے اس کا انکار کرتے ہیں۔ اس پر بھی اس کو پیش کرنا اور اس پر ناز کرنا پرلے
درجہ کی نادانی اور نامعقولیت ہے یہی حال باقی اُن روایتوں کا ہے جو پیش کی جاتی ہیں۔ ایسی ہر
ایک حدیث صرف ایک ہی شخص کی گواہی پر مبنی ہے جس کا کوئی دوسرا موید نہیں۔ اکیلے ابوموسیٰ اشعری
ہی کی روایت پر بیان کیا جاتا ہے کہ دو سورتیں قرآن شریف کی گم ہو گئی تھیں۔ ان کے سوائے ایک بھی
ایسا صحابی نہیں ہوُا جس نے اُن کی ہاں میں ہاں ملائی ہو۔ اور اُن کے غلط خیال کی تائید کی ہو۔

آیات قرآنی میں ایک آدمی کی شہادت وزن نہیں رکھتی

ایسے ہی حضرت عائشہؓ ایک آیت کا گم ہو جانا بیان کرتی ہیں۔ لیکن وہ بھی اپنے بیان کی تائید
میں ہزارہا صحابہؓ میں سے ایک گواہ بھی پیش نہیں کرتیں جہاں ابن مسعود ایک امر بیان کرتا ہے تو ابی
اور دوسرے تمام صحابی اس کی تردید کرتے ہیں۔ اور اگر ابی نے کوئی امر بیان کیا ہے تو ابن مسعود اور دوسرے
سارے صحابہؓ اس کے مخالف ہیں۔ غرض جہاں کہیں اس قسم کی کوئی روایت آئی ہے وہ صرف ایک
ہی شخص کا بیان ہے اور کوئی بھی دوسرا اُس کے بیان کا موید اور گواہ نہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ صرف
ایک ہی شخص کی گواہی سے یہ بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ جاتی کہ فلاں آیت قرآن شریف کی تھی۔ کیونکہ
یہ امر واقعہ ہے اور کثیر التعداد احادیث اس کی مصدق و موید ہیں کہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت نازل ہوتے
ہی عام طور پر شایع کر دی جاتی تھی۔ اور قرا اور حفاظ اس کو فوراً یاد کر لیا کرتے تھے جس روایت میں زید
کا بعہد خلافت حضرت ابوبکر صدیقؓ قرآن جمع کرنے کا ذکر ہے۔ اس کے اخیر میں جو روایت لکھی ہے کہ
سورہ براۃ کی ایک آیت گم ہو گئی ہوئی تھی اور وہ صرف ابوخزیمہ کے پاس دستیاب ہوئی تھی اس کی نسبت

سے اس نتیجہ کا انکار لازم نہیں آتا۔ کیونکہ ہم پہلے ثابت کر آئے ہیں کہ وہاں صرف تحریر کا ذکر ہے اور دوسری روایتوں سے ثابت ہے کہ اسی زمانہ میں قرآن شریف کے بہت لوگ حافظ اور قاری موجود تھے جن کو سارا قرآن از بر تھا اور جو از بر تلاوت کیا کرتے تھے۔ الغرض کوئی معقول انسان اس بات پر کبھی قایم نہیں رہ سکتا کہ صرف ایک شخص کی شہادت کو تمام صحابہ کی جماعت کی شہادت کے مقابلہ میں ترجیح دے اور اُن سب کو غلطی پر سمجھے *

تعامل اور تواتر قومی ان روایتوں کو غلط ٹھیراتا ہے

پھر ان روایات کی صحت پرکھنے کے لئے تیسرا معیار تواتر عملی یا تعامل ہے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین رسول اللہ علیہ وسلم کے ایسے عاشق تھے کہ جو بات آپ کے دہن مبارک سے سنتے یا جو کام آپ کو کرتے دیکھتے یا آپ کے جو فرمان کانوں سے سُن لیتے تو فوراً اُن کو عمل میں لے آتے۔ اور اسی طرح اُن سے اُن کی اولاد اور توابع نے اور اُن سے اُن کی اولاد اور توابع نے لے کر عمل کیا اور نسلاً بعد نسل عمل کرتے چلے آئے ہیں یہاں تک کہ وہ سب کچھ ہم تک پہنچ گیا۔ اس کو تعامل کہتے ہیں جو باتیں تعامل میں آچکی تھیں احادیث کی کتابوں میں نہ بھی لکھی جاتیں تو بھی کچھ حرج نہیں تھا۔ آنحضرت صلعم کے بعد سب سے زیادہ قیمتی چیز مسلمانوں کے ہاتھ میں قرآن شریف تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہر ایک مسلمان کے دل میں یہ جوش تھا کہ اس بیش بہا نعمت کو ہر قسم کی آمیزش اور تصرف سے محفوظ رکھکر آیندہ نسلوں کو پہنچانا ہے۔ اب اگر بفرض محال مان لیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تحکم سے بعض نسخے قرآن شریف کے معدوم کر دیئے تو یہ امر دیکھنا ضروری ہوگا کہ آیا اکیلے حضرت عثمان کا دخل اتنا بڑھا ہوا تھا اور اُن کی طاقت ایسی وسیع ہوگئی ہوئی تھی کہ اتنی بڑی قوم کے قبضہ اور حافظہ سے ہر ایک آیت اور سورۃ مٹا سکیں۔ اور اگر یہ بھی فرض کریں کہ ابن مسعودؓ جیسے مشہور لوگوں سے انہوں نے قرآن کے نسخے چھین لئے تھے تو یہ کیونکر سمجھا جا سکتا ہے کہ جو نقلیں عام طور پر اُن لوگوں کے قرآنوں کی مسلمانوں میں مشتہر اور مروج ہو چکی تھیں وہ بھی انہوں نے لوگوں سے لے لی تھیں؟ اور یہ ثابت شدہ بات ہے کہ قرآن کی بکثرت نقلیں اسی زمانہ میں مسلمانوں میں عام طور پر مروج ہو چکی تھیں۔ اگر اُن لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ والے نسخہ قرآن میں کوئی نقص معلوم ہوتا تو وہ حق کے لئے ایسے دلیر تھے کہ فوراً اس کو عیاں کر دیتے اور کسی کے رعب و سیاست سے نہ دبتے لیکن بطور تنزل اگر اتنا بھی مان لیا جائے کہ ان میں سے کسی مسلمان کو حضرت عثمان رضؓ کے نسخہ قرآن میں کوئی نقص معلوم ہوا تھا تو اتنا تو کوئی ضرور کرتا اور اس کے کرنے میں اس کو کوئی دقت بھی نہ تھی کہ جو نسخہ صحیح اس کے اپنے پاس یا کسی اور کے پاس معلوم ہوتا اس کو حضرت عثمان کے زمانہ میں چھپا کر ہی محفوظ رکھ لیتا اگر کوئی ایسا کرتا تو حضرت عثمان کے دور خلافت کے ختم ہونے کے بعد ایسے

قرآن کی نقلیں فوراً جابجا پھیل جاتیں۔ اور خصوصاً جب حضرت علی کا زمانہ آیا تھا تو چونکہ انہیں حضرت عثمان رضؓ کے قرآن شریف کے مختلف نسخوں کو لیکر ایک مکمل نسخہ بنانے کی تدبیر کو اپنے زمانہ میں مروج رکھنے کی کوئی خاص غرض نہ تھی اس لئے اُن کے زمانہ میں ایسا نسخہ قرآن شریف کا بہت آسانی اور عمدگی کے ساتھ وسیع اشاعت بلا تکلف حاصل کرسکتا تھا۔ اس طرح حضرت علی کے زمانہ میں بہت سارے ایسے قرآنوں کے نسخے مروج ہو جاتے۔ اگر انہیں حضرت عثمان کے جمع کردہ نسخہ سے ذرہ بھی اختلاف ہوتا اور اسکی اشاعت و رواج کو روکنے کی جرات اپنے میں نہ پاتے تو اتنا تو ضرور ہوتا کہ دوسرے جس کسی نسخہ قرآن کو اس نسخہ سے زیادہ اچھا سمجھتے اسکو ہی شائع کرتے۔ لیکن حضرت عثمان نے ایسی احتیاط اور امانت سے کامل قرآن شریف نقل کرایا تھا کہ تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اس کی صحت پر صاد تھا۔ بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ وہ تمام صحابہ رضؓ کا متفقہ طور پر لکھا ہوا قرآن تھا۔ یہ ایسا مقبول کام تھا۔ کہ وہ لوگ جو حضرت عثمان رضؓ سے ایسے ناراض ہوئے تھے اور اُن میں آتش غضب اُن کے برخلاف اس حد تک بھڑک اٹھی تھی کہ امیر المومنین کے خون میں ہاتھ رنگ لئے تھے اُن لوگوں نے بھی اس قرآن میں کوئی نقص نہ پایا اور نہ بیان کیا۔ اور نہ ہی انہوں نے اس سے کوئی جدا نسخہ قرآن پیش کیا۔ اور نہ ہی کسی سورت تو کیا ایک آیت کی کمی بیشی ہی بیان کی۔ بلکہ یہاں تک کہ انہوں نے باوجود اس قدر حرف گیری کے اتنا بھی اشارہ نہ کیا کہ کوئی ایک لفظ بلکہ حرف ہی حضرت عثمان رضؓ نے بدلا ہے غور کی جگہ ہے کہ جب حضرت عثمان رضؓ کی طاقت کا خاتمہ ہو گیا یعنی جب وہ باغیوں کے ہاتھوں سے مقتول ہو گئے۔ تو پھر جن حصص قرآن کو حضرت عثمان رضؓ نے دبا رکھا تھا اور شائع نہ کیا تھا اُن کے شائع کرنے میں کونسی رکاوٹ کسی کو مانع ہو سکتی تھی۔ اگر یہ بھی مانا جائے کہ حضرت عثمان رضؓ کی سیاست ایسی غالب آئی تھی کہ انہوں نے تمام ایسے نسخے چھوا کر ضائع کر دیئے تھے تو اُن کی شہادت کے بعد ابھی بہت سارے قرأ اور حفاظ زندہ تھے جن کے دلوں کی الواح پر قرآن شریف کا حرف حرف زمانہ نزول سے ہی منقش اور منضبط تھا۔ اُن کو حضرت عثمان مٹانے پر کیسے قادر ہو سکتے تھے۔ اُن کا تو کسی فانی ہاتھ کی کوشش سے محو ہونا ناممکن محض تھا۔ قرآن شریف کے تمام ایسے حصے جن کے دبا رکھنے کا الزام حضرت عثمان رضؓ پر بے جا اعتراض کرنے والے لگاتے ہیں وہ سب کے سب حضرت عثمان رضؓ کی شہادت کے ساتھ ہی رواج عام میں آجاتے۔ اور قرآن میں شامل کر دیئے جاتے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا تاریخ اس گواہی کے لئے تیار ہے کہ کسی اس قسم کی بات کا پتہ دیوے؟ سچی بات تو یہ ہے کہ تاریخ میں ہرگز ہرگز اس کا کوئی سراغ نہیں چلتا باوجودیکہ مسلمانوں کو ابتدائی زمانہ میں ہی باہمی اختلاف نے علیحدہ علیحدہ کر دیا تھا۔ اور اس کے بعد طرح طرح کے اختلافات

ان میں پیدا ہوتے گئے۔ لیکن باوجود ان سب اختلافات کے مختلف لوگوں اور مختلف فرقوں میں صرف یہی ایک قرآن جو حضرت عثمانؓ نے لکھوایا تھا بلا کسی قسم کے اختلاف کے ہمیشہ سے مروج اور مسلم چلا آیا ہے۔ اگر واقع میں کوئی اختلاف موجود ہوتا تو ضرور تھا کہ قرآن شریف کے نسخوں میں کسی نہ کسی طرح اس کو دخل ہو جاتا۔ لیکن تمام مسلمان جن میں بعض ایک دوسرے کے خونی دشمن بھی ہوتے رہے ہیں اور تمام اسلامی فرقے جو بعض بعض کے خون آشام حریف ہیں صرف ایک ہی قرآن شریف ہمیشہ سے مانتے چلے آتے ہیں۔ اس جمہوری اتفاق سے یہ امر پایۂ ثبوت کو زیادہ وضاحت سے پہنچتا ہے کہ اس قرآن شریف

بعض شیعوں کا اعتراض اور میور کا جواب

موافق جمع کیا گیا تھا بعض واقف اہل تشیع محض حضرت عثمانؓ یا حضرت ابوبکرؓ پر اعتراض کے لحاظ حفاظت قرآن کو زیر بحث لے آتے ہیں۔ اُنکے لئے ہم میور صاحب کی "لائف آف محمدؐ" سے چند فقرات اقتباس کرنے پر کفایت کرتے ہیں۔ اس شخص نے خود ہی اعتراض اٹھایا ہے اور آپ ہی اس کا جواب دیا ہے اس

پر کفایت کرتے ہیں۔ اس شخص نے خود ہی اعتراض اٹھایا ہے اور آپ ہی اس کا جواب دیا ہے اس

بات کو تسلیم کر کے کہ ہمارے ہاتھوں میں بلا تغیر و تبدل وہی نسخہ موجود ہے جو حضرت عثمان نے شائع کرایا تھا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ نسخہ قرآن شریف کا زید والے قرآن شریف کے ساتھ سوائے خفیف اصلاحات کے بالکل مطابق ہے؟ اس بات کے ماننے کیلئے پورے پورے دلائل موجود ہیں کہ واقع میں ایسا ہی ہے۔ کسی پرانی روایت اور معتبر حدیث سے ذرہ بھر بھی شک کرنے کی وجہ پیدا نہیں ہوتی کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے دعوے کی تائید میں قرآن شریف میں ایک ذرہ بھر تصرف کیا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ متاخرین شیعوں نے غلطی سے یہ بات بنا رکھی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے بعض سورتیں اور بعض آیتیں عمداً درج قرآن نہ کرنے دی تھیں۔ اور وہ سورتیں اور آیتیں ایسی تھیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دعاوی کی موید تھیں۔ لیکن شیعوں کی یہ بات بالکل اعتبار کے قابل نہیں جب حضرت عثمان کا نسخہ قرآن تیار ہوا تو حضرت علیؓ کے پیرووں اور بنو امیہ میں کوئی ظاہری اختلاف پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور اخوت و وحدت اسلامی میں کوئی فرق واقع نہ ہوا تھا۔ حضرت علیؓ کے دعوے ابھی تک منصۂ ظہور میں آئے ہی نہ تھے کوئی ایسی غرض کافی طور پر نظر نہیں آتی کہ جس نے ایسے وقت میں حضرت عثمانؓ کو ایسے مکروہ اور سیاہ جرم کے ارتکاب پر آمادہ کر دیا ہو جو مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ تاریک گناہ ہے۔ پھر ماسوا اس کے جب حضرت عثمانؓ نے قرآن جمع کر کے اس کو مستند طور پر شائع کیا تھا تو وہ ایسا زمانہ تھا کہ جب کہ ابھی ہزارہا ایسے آدمی زندہ موجود تھے جنہوں نے وقت نزول سے ہی قرآن شریف کو سنکر حفظ کر لیا ہوا تھا۔ اور اگر کوئی سورۃ یا آیت ایسی ہوتی جو حضرت علیؓ کے دعوے کی موید تھی تو ضرور تھا کہ وہ ہزار ہا لوگوں

کے ہاتھوں میں محفوظ ہوتی جو حضرت علیؓ کے ساتھ خاص اخلاص اور تعلق رکھتے تھے۔ یہ دونوں ایسی باتیں تھیں کہ ان سے اصل قرآن میں کسی قسم کے تصرف و تغیر کا دخل پانا ممکن ہی نہیں تھا پھر اس کے علاوہ حضرت عثمانؓ کے فوت ہوتے ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خیر خواہوں کی جماعت کا غلبہ ہو گیا۔ اور ایسی آزاد طاقت حاصل کر لی کہ اُن کو خلیفہ بنا دینے میں کامیاب ہو گئے۔ کیا یہ گمان صحیح ہو سکتا ہے کہ جب اس طرح اُن کو قوت اور دولت مل گئی تھی تو اس وقت وہ اسی ناقص قرآن شریف کے رواج کی اجازت دے رکھتے؟ اور ناقص بھی ایسا کہ اُن کے اپنے پیشوا حضرت علیؓ ہی کے دعووں کی آیات اور سور کے اندراج سے ناقص۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ بھی اسی قرآن کو بلا قیل و قال ہمیشہ استعمال کرتے رہے اور اُن کے مخالف بھی اسی قرآن کو پڑھتے رہے۔ اور خفیف سے خفیف اعتراض بھی اس کے خلاف نہیں کیا۔"

محققین اہل تشیع حفاظت قرآن کے قایل ہیں

اس جگہ یہ بات بھی ذکر کرنے کے قابل ہے کہ شیعوں کی ساری جماعت ہی ایسا اعتقاد نہیں رکھتی کہ قرآن شریف کے کچھ حصے کم ہو گئے تھے۔ یا وہ سورتیں جو حضرت علیؓ کے دعووں کی موید تھیں اُن کو حضرت عثمانؓ یا زیدؓ نے عمداً چھوڑ دیا تھا۔ ان لوگوں میں بھی زیادہ ایسے ہوئے ہیں اور ہیں جو مانتے ہیں کہ قرآن شریف ہر قسم کی آلایش اور تصرف سے پاک ہے۔ اور یہی قرآن شریف جو بین الدفتین دنیا میں موجود ہے۔ زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور زمانہ صحابہؓ اور زمانہ تابعین میں تھا۔ اور یہی بلا تغیر و تبدیل حرفے و حرکتے موجود ہے۔ یہی اعتقاد بڑے بڑے فضلا اور محققین اہل تشیع کا ہے۔ البتہ جاہل لوگ ایسا اعتقاد رکھتے ہیں کہ بعض حصص قرآن شریف گم ہو گئے ہوئے ہیں چنانچہ ہم تفسیر صافی میں سے جو اہل شیعہ کی ایک بڑی معتبر تفسیر ہے اور آج کل اُن کے مدارس میں بطور درس داخل ہے چند فضلائے اہل تشیع کی آراء لکھتے ہیں جو انہوں نے اس قرآن شریف کی نسبت جو آج کل دنیا میں رائج ہے ظاہر فرمائی ہیں۔ اس تفسیر میں ملا محسن جاہل شیعوں کے خیالات کی تردید کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے فقد روی جماعة من اصحابنا وقوم من حشویة العامة ان فی القرآن تغیراً ونقصاناً والصحیح من مذهب اصحابنا خلافه وبلغت حد التواتر بلغه فیما ذکرناه لان القرآن معجزة النبوة وماخذ العلوم الشرعیة والاحکام الدینیة وعلماء المسلمین قد بلغوا فی حفظه وحمایته الغایة حتی عرفوا کل شئ اختلف فیه من اعرابه وقرأته وحروفه وایاته فکیف یجوز ان یکون مغیراً او منقوصاً مع العنایة الصادقة و الضبط الشدید یعنی ہمارے دوستوں کی ایک جماعت اور عوام حشویہ نے یہ روایت کی ہے۔ کہ

قرآن شریف میں تغیر اور نقصان ہے اور ہمارے اصحاب کا صحیح مذہب اس کے خلاف ہے۔ اور نیز ان لوگوں کی رائے اس حد تک پہنچی ہے کہ ہم اس کو بیان نہیں کر سکتے اور اصل بات یہ ہے کہ قرآن نبوت کا اعجاز اور علوم شرعیہ اور دینی احکام کا ماخذ ہے اور علمائے اسلام نے یہاں تک اسکی حفاظت اور حمایت کی ہے کہ انہوں نے ہر چیز پر جس پر اعراب اور قرأت اور حروف اور آیات کے بارہ میں اختلاف کیا گیا ہے۔ عرفان تام اور واقفیت عام پیدا کرلی ہے پھر کیونکر ممکن ہے کہ ایسے ضبط شدید اور حفاظت صحیحہ کی موجودگی میں کسی قسم کا تغیر یا کمی ہونے پائی ہو (دیکھو تفسیر صافی بلا الحسن صفحہ ۱۴) پھر آگے چل کر مصنف مذکور اسی صفحہ پر لکھتا ہے ان القرآن علیٰ عھد رسول الله مجموعاً مؤلفاً علی ماھو علیه الآن واستدل علیٰ ذٰلك بان القرآن کان یدرس و یحفظ جمیعه فی ذلك الزمان حتیّٰ عین علیٰ جماعة من الصحابة فی حفظھم له وانه کان یعرض علی النبی وﷺ علیه وان جماعة من الصحابة مثل عبد الله بن مسعود و ابی بن کعب وغیرھما ختموا القرآن علی النبی عدة ختمات وکل ذٰلك یدل باد نیٰ تامل علیٰ انه کان مجموعاً غیر مبثور و مبثوث وذکران من خالفه فی ذٰلك من الامامیه والحشویة لایعتد بخلافھم فان الخلاف فی ذٰلك مضاف الی قوم من اصحاب الحدیث نقلوا اخباراً ضعیفة یعنی یہی قرآن رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں اسی طرح جمع شدہ اور اکٹھا تھا۔ جس طرح آج کل ہے اور اس پر یہ دلیل ہے کہ قرآن حمید مکمل و مجموعی طور پر اس زمانہ مبارک میں پڑھا جاتا اور حفظ کیا جاتا تھا۔ اور صحابہ کی ایک جماعت مثل عبداللہ وابی بن کعب وغیرہ نے چند مرتبہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ختم کیا۔ اور ان باتوں پر ادنی تامل و تفکر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن مرتب و مدون تھا۔ تتر بتر نہیں تھا۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ امامیہ یا حشویہ میں سے جن لوگوں نے اس رائے کی مخالفت کی ہے اُن کی اس کے مقابل میں کوئی حقیقت اور شمار نہیں ہے۔ کیونکہ یہ خلاف صرف اصحاب حدیث سے ہوا ہے جنہوں نے ضعیف خبریں نقل کر دی تھیں۔

مابین الدفتین کے اصلی ہونے پر اجماع

پھر مفسر مذکور اپنی تفسیر میں بہت سے بڑے بڑے مسلم اور مستند علماء وفضلا و محدثین امامیہ کے اعتقاد کا اقتباس کرتا ہے کہ جنکی عظمت اور لیاقت کی شہرت کا سکہ تمام شیعہ دنیا میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے بہت سے حوالے ایسے نقل کئے ہیں جن میں یہ لوگ صاف اور کھلے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ یہ قرآن جو بین الدفتین مسلمانوں میں رائج ہے یہ ٹھیک وہی قرآن ہے جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا تھا۔ اور اس میں کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک حدیث

بھی نقل کی ہے جو امامیہ فرقہ میں بہت مستند اور مسلم حدیث ہے۔ اور جس کی اسناد پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔ یہ حدیث بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے کہ یہی قرآن شریف جو دنیا میں عام طور سے مروج ہے لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً وہی ہے جو آنحضرت صلعم پر نازل ہوا تھا اور جس طرح آپ نے ترتیب دلائی تھی۔ اور اس میں کسی تبدل و تغیر کو کسی طرح سے دخل نہیں ہوا۔

اِن مذکورہ بالا حوالوں سے کافی طور پر ثابت ہے کہ علمائے محققین فرقہ امامیہ کو بھی مسلمانوں کے دوسرے فرقوں کے علماء کے ساتھ اس بات میں اتفاق ہے کہ یہ قرآن شریف جو بین الدفتین مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ ٹھیک وہی ہے جو آنحضرت صلعم پر نازل ہوا تھا۔ اور کہ اس میں کسی قسم کی دسترس کسی غیر کی نہ اس کی ترتیب میں نہ آیت و لفظ و حرف میں بلکہ کسی حرکت کے بدلنے میں بھی ہو سکی۔ اگر یہ نادان معترض قرآن شریف کے اس اعجاز کی طرف نظر غور اٹھا کر دیکھتے کہ جب کہ حضرت عثمانؓ کا شائع کردہ قرآن آج تک دنیا میں اس قدر وسیع طور سے مروج اور شائع ہو چکا ہے۔ اور اسلامی اقوام اس قدر دور دور پھیل گئی ہیں مگر مختلف ممالک میں رہنے مختلف زبانوں کے بولنے کے باوجود جہاں کہیں جاؤ تیرہ سو برس سے وہی قرآن موجود ہے۔ اور اس میں کسی قسم کا اختلاف اور تغیر واقع نہیں ہو سکا تو پھر کیونکر ممکن تھا کہ صرف تیرہ برس کے ایسے پاک زمانہ ہی میں اس میں کسی کی دستبرد کو راہ مل جاتی وہ تو ایسا زمانہ تھا کہ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد صرف تیرہ سال ہی گذرے تھے اور مسلمانوں میں وحدت موجود تھی۔ اور ایک ملک اور قریباً ایک ہی زبان کے سمجھنے والے تھے۔ اور اُن میں کثیر التعداد ایسے قراءُ حفاظ موجود تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر قرآن حفظ کیا ہوا تھا۔ اور تازہ تازہ زمانہ تھا۔ اور اس کے بعد ہمارے زمانہ تک مختلف قوموں میں ہزارہا اختلافات واقع ہوئے ہزارہا قومیں مختلف ملکوں میں رہنے والی اور مختلف زبانیں بولنے والی اسلام میں داخل ہو گئیں پھر جب کہ اس تیرہ سو برس کے لمبے زمانہ میں ایک حرکت بھی بدل نہیں سکی تو اس پہلے زمانہ کی نسبت کسی تبدیلی یا فروگذاشت کا خیال کرنا ہی سراسر حق کا خون کرنا ہے۔ وہ ابتدائی زمانہ ایسا تھا کہ جس میں وہ اسباب جن سے قرآن شریف ہر آلایش اور تصرف سے محفوظ رکھا جا سکتا تھا۔ بہت کثرت سے موجود تھے صحابہ رسول کریم صلعم اور تمام متقدمین اس بات کو علیٰ وجہ البصیرت مانتے اور جانتے تھے کہ قرآن شریف میں سے کچھ بھی کم نہیں ہوا۔ امام بخاری نے ایک حدیث لکھی ہے اور یہ ایسی حدیث ہے کہ جس کی صحت پر کوئی جرح واقع نہیں ہوئی اور وہ یہ ہے کہ جب ابن عباس اور محمد بن حنفیہ سے پوچھا گیا کہ آنحضرت صلعم نے کیا چھوڑا ہے تو دونوں نے متفق اللفظ ہو کر جواب دیا کہ ما ترک الا ما بین الدفتین

"یعنی آپ نے وہی کچھ چھوڑا ہے جو بین الدفتین موجود ہے"! واضح رہے کہ بین الدفتین کی اصطلاح وہ ہے جو اس قرآن شریف کے لئے پہلے بولی گئی تھی۔ جو حضرت عثمانؓ نے شایع کیا تھا۔ انکا مطلب یہ تھا کہ یہی قرآن جو حضرت عثمانؓ نے شایع کیا ہے آنحضرت صلعم نے پیچھے چھوڑا ہے۔

ڈاکٹر منگانا کے تین قدیم قرآنوں کے اوراق

اب ہم ڈاکٹر منگانا کے دریافت کردہ نسخہ ہائے قرآنی کو لیتے ہیں۔ اصل مالکہ اُن اوراق کی ایک لیڈی ہیں۔ اور انہوں نے یہ اوراق اشیائے قدیم کے تاجروں سے ۱۸۹۵ء میں بمقام سویز خریدے تھے ان اوراق پر یکے بعد دیگرے تین قدیم تحریریں ایک دوسری کے اوپر لکھی ہوئی تھیں اور سب سے نیچے قرآن کریم کی کچھ عبارتیں تھیں۔ مگر جب اُس کے بعد دوسری عبارت انہی اوراق پر لکھی گئی تو پہلی عبارت کو نرم پتھر کے ساتھ رگڑ کر محو کر دیا گیا۔ پھر مرور زمانہ سے وہ پہلی تحریر کچھ دھیمی سی نظر آنے لگی ہوتے ہوتے یہ اوراق ڈاکٹر منگانا کی نظر کے نیچے آ گئے جو اپنی لیڈی دوست کے مہمان تھے۔ اور انہوں نے بڑی محنت کے ساتھ اس محوشدہ تحریر کو پڑھ کر ان اوراق کی عبارات قرآنی کو ۱۹۱۴ء میں ایک کتاب کی شکل میں شایع کیا جس کا نام انہوں نے "لیوز فرام تھری انشنٹ قرآنز" یعنی تین قدیم قرآنوں کے اوراق" رکھا اور یہ دعویٰ کیا کہ ان اوراق سے قرآن کریم کے مستند نسخہ میں جو آج ساری اسلامی دنیا میں مروج ہے۔ اور دیگر نسخہ جات میں جو پہلے کسی زمانہ میں مروج تھے اختلاف ثابت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر منگانا کی لیڈی دوست جو ان اوراق کی اصل مالکہ ہے بڑی جرات سے اس بات کا بھی اعلان کرتی ہے کہ یہ اوراق ان نسخہ جات کے اوراق ہیں جو حضرت عثمان کے زمانہ سے پہلے مروج تھے اور جن کو حضرت عثمان نے خود چار یا پانچ مستند نسخے تیار کرانے کے بعد جلا دینے کا حکم دیا تھا تا کہ آیندہ جسقدر نسخہ جات قرآنی تیار ہوں وہ ان مستند نسخوں کی نقلیں ہوں۔ ڈاکٹر اگنس سمتھ لوئیس کا جو ان اوراق کی مالکہ کا نام ہے۔ یہ خیال ہے کہ یہ اوراق حضرت عثمان کے ہاتھ نہیں لگے اور اُن کے مالک نے قرآن کریم کی عبارات کو چمڑے کے کاغذوں سے مٹا کر کاغذات کو فروخت کر دیا۔ حضرت عثمان کے زمانہ کے بعد کے یہ کیوں نہیں ہو سکتے۔ اس کی وجہ ڈاکٹر لوئیس کو سوائے اس کے کوئی نہیں مل سکی کہ اس قسم کی عبارات کا حضرت عثمانؓ کے وقت کے بعد لکھا جانا ایک بے معنی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر ان کا دوست ڈاکٹر منگانا اس بارہ میں زیادہ محتاط ثابت ہوا ہے۔ وہ صرف اس قدر کہتا ہے کہ ان مسودات کے بعض حصص کا آٹھویں صدی کی ابتدا کا ہونا (جو حضرت عثمان کے بہت بعد کا زمانہ ہے) اغلب ہے، وہ ان کو حضرت عثمان سے پہلے کے لکھے ہوئے قبول کرنے کے لئے کسی صورت میں تیار نہیں۔ ہاں یہ کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ ان اوراق عثمانی سے جو جلنے سے کسی تدبیر سے بچائے

گئے ہوں یا اوراق نقل کئے گئے ہوں۔ مگر یہ بھی محض بطور ایک خیال کے پیش کیا گیا ہے اور کوئی قطعی فیصلہ اس بات پر دینے سے ڈاکٹر منگانا نے اپنے آپ کو روکا ہے۔

ان اوراق میں ذیل کی عبارات یعنی سورتوں کے ٹکڑے پائے جاتے ہیں۔ الاعراف - ۱۳۹- ۱۶۰- التوبۃ- ۱۸- ۷- ہود- ۲۰- ۳۹- رعد- ۱۸- ۴۳- ابراہیم- ۱- ۸- الحجر- ۸۵- ۹۹- النحل- ۱- الم و- ۸۰- ۱۲۸- بنی اسرائیل ۱- ۵۷- النور- ۱۷- ۲۹- القصص- ۱۴- ۵۱- العنکبوت- ۱۷- ۳۰- المومن ۸- ۷- ۸۵- حٰم فصلت- ۱- ۲۰- الدخان- ۳۸- ۵۹- الجاثیہ- ۱- ۲۰- یہ حصص سارے کے سارے ایک ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں۔ بلکہ ڈاکٹر منگانا کی رائے میں چار مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور اُن کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات کا بھی کچھ ذکر کیا گیا ہے۔ ایک مشترکہ خصوصیت سب کی یہ ہے کہ ان میں حرف ہمزہ نہیں پایا جاتا۔ کل اختلافات کو جو ان اوراق میں مستند نسخہ سے جو اسلامی دنیا میں مروج ہے پائے جاتے ہیں ڈاکٹر منگانا نے تین حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جس میں ایک لفظ کی بجائے دوسرا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں کوئی چھوٹا سا اختلاف و کا ہونا یا نہ ہونا و کی بجائے ف یا قؔ کی بجائے و کا ہونا یا اس قسم کے اختلاف دکھائے گئے ہیں تیسرا حصہ وہ ہے جس میں کوئی لفظ زاید پایا جاتا ہے یا کوئی لفظ کم پایا جاتا ہے۔ حصہ اول میں چار اختلاف۔ حصہ دوئم میں تیس اور حصہ سوئم میں چار اختلاف دکھائے گئے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے میں حصہ دوئم کو لیتا ہوں جس میں اختلافات کی تعداد زیادہ دکھائی گئی ہے۔

کاتبوں کی غلطیاں

قبل اس کے کہ ان اختلافات پر بحث کی جائے ان کل اختلافات کے متعلق میں چند الفاظ یکجائی طور پر کہنا چاہتا ہوں۔ اُن میں سے امر اول یہ ہے کہ قرآن کریم کے مختلف مسودات میں اختلافات دکھانے کیلئے صرف اس قدر دکھانا کافی نہیں کہ ایک مسودہ میں ایک لفظ اور طرح پر لکھا ہوا ہے۔ اگر اس سے اختلاف ثابت ہو جاتا ہے تو پھر اشیائے قدیم کے تاجروں سے چند اوراق خریدنے اور اُن پر محنت اور ذہانت صرف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اس قسم کے اختلافات آج چھپے ہوئے نسخہ جات قرآنی میں بھی دکھائے جا سکتے ہیں۔ جو کاتب کی غلطی کا نتیجہ ہیں۔ ہم یہ نہیں مانتے کہ پچھلے زمانہ کے کاتب فرشتے تھے۔ وہ بھی انسان تھے۔ بلکہ ذرائع علم و مقابلہ چونکہ اس قسم کے موجود نہ تھے جیسے ہمارے زمانہ میں ہیں اس لئے اُن سے غلطی کا ہو جانا اور پھر اسکا درست نہ ہو سکنا اور بھی زیادہ قرین قیاس ہے۔ یہی تو وہ بات تھی جس کی اصلاح کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مختلف مسودات کو جو لوگوں نے اپنے اپنے طور پر رکھے ہوئے تھے جلوا دیا۔ کیونکہ ان لکھنے والوں سے کافی اہتمام درستی

نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے آپ نے چار یا پانچ بڑے بڑے مرکزوں میں مستند نسخے قرآن شریف کے رکھوا دیئے۔ تا وہاں آسانی سے مقابلہ ہو کر صحیح نسخہ جات عالم اسلامی میں شایع ہوں۔ تعجب ہے کہ اس امر پر جو ایک اعلیٰ درجہ کی دور اندیشی پر مبنی تھا آج حضرت عثمان پر حرف رکھا جاتا ہے۔ وہ زمانہ چھاپے خانوں کا تو تھا نہیں کہ ایک سرکاری ایڈیشن شایع کر دی جاتی اور اس کی کاپیاں کل اطراف عالم میں پہنچا دی جاتیں۔ صحت کا اہتمام جو کچھ ہو سکتا تھا وہ یہی تھا کہ بڑے بڑے مرکزوں میں صحیح نسخہ جات موجود ہوں اور اُن کے ساتھ لوگ مقابلہ کر لیں۔ پس اگر کسی نسخہ میں کوئی فرق پایا جاتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ اختلاف قرآن میں ہے۔ ایک احمقانہ حرکت ہے۔ اختلاف دکھانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے کم سے کم تین نسخہ جات دکھائے جائیں جن میں ایک لفظ کی بجائے دوسرا لفظ ہے۔ یا کوئی لفظ دوسری طرح پر لکھا گیا ہے یا کسی لفظ کی کمی بیشی ہے۔ مثلاً ایک کاتب ومن کی جگہ فمن لکھ دیتا ہے۔ تو یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ قرآن کریم میں جو ومن لکھا ہے وہ غلط ہے بلکہ اس کا فمن لکھنا اس کی غلطی ہوگی۔ ہاں اگر کم سے کم تین مختلف کاتب دکھائے جائیں جنہوں نے ایک دوسرے سے یا ایک ہی نسخہ سے نقل نہ کیا ہو۔ اور وہ تینوں ایک خاص موقعہ پر ومن کی بجائے فمن لکھتے ہوں تو سمجھا جائیگا کہ یہ ایک اختلاف ہے۔ پس سب سے اول اس اصول کا یاد رکھنا ضروری ہے۔ کہ ایک کاتب کے ایک لفظ کو دوسری طرح لکھ دینے سے صرف یہی ثابت ہوگا کہ اس سے غلطی ہو گئی۔ اور اس سے قرآن کریم میں کوئی اختلاف ثابت نہیں ہوتا۔

مسودات منگانا کے متعلق قیاسات

دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ موجودہ نسخہ جسے پیش کیا گیا ہے وہ کیا چیز ہے۔ وہ کوئی پرانی تحریر اس قسم کی نہیں جس کے متعلق یقین سے یہ کہا جا سکے کہ اُسے کس نے لکھا اور کب لکھا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی عیسائی نے چند الفاظ میں تغیر و تبدل کر کے اس کو مسلمانوں میں شایع کرنے کی کوشش کی ہو اور کسی مسلمان کے ہاتھ آنے پر اس نے اس تحریر کو بوجہ ان غلطیوں کے ہی محو کر دیا ہو۔ یا خود اس عیسائی نے ہی اپنے آپ کو ناکام پا کر پھر ان حروف کو مٹا دیا ہو۔ ابتدائی زمانہ کے بعض عیسائی بزرگوں نے تو دین کی خاطر جھوٹ بولنے کو بھی جائز رکھا۔ اور پھر جب خود کئی وضعی اناجیل بن سکتی ہیں جن کا وضعی ہونا عیسائی دنیا کو مسلم ہے تو یہ کیوں ممکن نہیں کہ اسی طرح پر چند آیات قرآنی میں بھی تغیر و تبدل کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کا اپنا وعدہ اس کلام الٰہی کی حفاظت کا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسی کوشش کرنے والے کو ناکام کیا ہو

اس بات سے کہ یہ صرف چند ٹکڑے چند سورتوں کے ہیں کوئی کہیں سے اور کوئی کہیں سے اور پھر چار مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے ہیں اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔ یہ کوئی کامل جلد قرآن شریف کی نہیں ہے نہ پوری ایک سورت ہی ہے۔ تیسرا امر ضروری یہ دیکھنا ہے کہ اس مسودہ کی حیثیت کیا ہے اس پر پہلے عربی عبارت لکھی گئی۔ پھر جب کسی دوسری عبارت کے لکھنے کی ضرورت پیش آئی تو اصل عربی عبارت کو نرم پتھر کے ساتھ چمڑے کے کاغذ کو رگڑ رگڑ کر اس کاغذ کو صاف کیا گیا۔ اور اس پر دوسری عبارت لکھی گئی۔ پھر اس پر کسی تیسرے زمانہ میں کوئی اور ہی عبارت لکھی گئی۔ سو اول تو اس قدر گڈ مڈ میں اصل الفاظ کو پہچاننا ایک نہایت دشوار کام ہو جاتا ہے اور ہشیار سے ہشیار پڑھنے والے کو بھی غلطی لگ سکتی ہے۔ چہ جائیکہ ایک مخالف گواہ کے ہاتھ میں ایسے مسودہ کو دیکر سارا اعتبار شہادت کا اسی پر رکھا جائے۔ کہ جو کچھ وہ کہہ دے وہ درست ہے۔ یہ کوئی قدیم زمانہ کی صفائی سے لکھی ہوئی تحریر نہیں کہ اس کو آسانی سے پڑھا جا سکے۔ اور اس میں کسی کا شبہ واقع نہ ہو سکے پھر پتھر سے رگڑنے میں یہ ظاہر ہے کہ بعض حروف کی سیاہی پھیل گئی ہو اور ایک حرف کے نقطوں نے اصل حرف کیساتھ مل کر کوئی اور ہی شکل اختیار کر لی ہو یا بعض حصص ایسے اڑ گئے ہوں کہ وہ دوبارہ نمودار ہونے کے قابل ہی نہ رہے ہوں۔ چنانچہ کئی سطروں کے کئی حصے اس طرح پر محو شدہ ان عبارات کے اندر موجود ہیں۔ مثلاً صفحہ ۶ پر سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۹ و ۱۶۰۔ ڈاکٹر منگانا کے نسخہ میں یوں لکھی ہوئی ہیں۔ ومن قوم موسی امة یھدون با ۱ . . . و بہ یعدلون قطع . . ھم . . . اسباط . . . امما واوحینا الی موسیٰ اذ استسق . . . قومہ ان اضرب بعصاك اس کے بعد سارے الفاظ محو ہیں۔ اب اصل عبارت یوں ہے ومن قوم موسی امة یھدون بالحق وبہ یعدلون ٥ وقطعنھم اثنتی عشرۃ اسباطا امما واوحینا الی موسیٰ اذ استسقہ قومہ ان اضراب بعصاك . . . . . . اب ان چند الفاظ میں بالحق کا صرف با ا پڑھا جاتا ہے باقی محو ہو گیا ہے قطعنھم میں سے پہلا اور پچھلا حصہ موجود ہیں درمیانی حصہ محو ہے اسباطا کا آخری الف محو ہے استسقہ میں آخری حرف محو ہے اور قطعنھم کے پہلے جو و ہے وہ محو ہے اب یہ کہنا بجا نہ ہو گا کہ اس نسخہ کے لکھنے والے کو اصل قرآن سے اختلاف ہے کہ وہاں قطعنھم کے پہلے و ہے اس نسخہ میں نہیں۔ بلکہ جس طرح دوسرے الفاظ کے بعض حصص بالکل محو ہو گئے یہ بھی محو ہو گیا۔ اس کی مثالیں کثرت سے انہی اوراق سے دی جا سکتی ہیں۔ مگر ہماری غرض کیلئے یہ ایک مثال ہی کافی ہے۔ اسی طرح جب کاغذ صاف کر کے دوسری عبارت لکھی گئی تو بالکل

قرین قیاس ہے کہ اس دوسری عبارت کے بعض شوشے یا نقطے (کیونکہ اس میں بھی نقطے ہیں) پہلے پھیکی سیاہی کے ساتھ مخلوط ہو کر کوئی اور شکل اختیار کر چکے ہوں۔ غرض ایک عبارت کو پتھر سے رگڑ کر محو کرنے میں پھر اس پر دوسری عبارت لکھنے میں کئی قسم کے تغیر آجانا قرین قیاس ہے۔ اس لئے ایسا مسودہ قرآن کریم کے مستند نسخہ کے خلاف جس پر تحریر اور حافظہ کل اسلامی دنیا کا متفق ہو بطور شہادت پیش کرنا کسی عقلمند کا کام نہیں۔

پڑھنے والوں کا تعصب

چوتھی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ اس مسودہ کے جو ایسی گنڈمنڈ حالت میں ہے پڑھنے والے کون ہیں۔ ایک ڈاکٹر منگانا اور دو ان کی دوست لیڈیاں۔ جو تینوں کے تینوں بوجہ اُن خیالات کے جو اسلام کے خلاف اُن کے دلوں میں بچپن سے جاگزین ہیں ایک رائی کا پہاڑ بنانے کو تیار ہیں۔ ایسے لوگوں کی نظر منقدانہ کہاں ہو سکتی ہے۔ چاہئے تھا کہ کوئی بے لوث شہادت اپنے اس پڑھنے پر پیش کی جاتی۔ اس کی میں ابھی مثالیں دوں گا۔ کہ کس طرح پر تعصب نے اُن کی نظر کو وہ کام کرنے سے روکا ہے جو ایک منصف کی نگاہ آسانی سے کر سکتی تھی۔ پس جو نسخہ پیش کیا جاتا ہے نہ اُس کے لکھنے والے کی شہادت قابل اعتبار۔ نہ خود نسخہ ایسا کہ اس کی بنا پر کسی عدالت میں شہادت قابل اعتبار سمجھی جائے نہ اس نسخہ کا پڑھنے والا ایسا بے تعصب ہو کر شہادت دے سکے اس قدر مشکلات کے اندر اس نسخہ کو قرآن کریم میں اختلافات کی شہادت کے طور پر پیش کرنا ایک مجنون کی بڑ سے بڑھ کر کوئی وقعت نہیں رکھتا

ان مسودات کے اختلافات اختلافات قرات میں سے نہیں

ایک اور بات جو ان اختلافات پر روشنی ڈالتی ہے یہ ہے۔ کہ جس قدر اختلافات ڈاکٹر منگانا نے دکھائے ہیں وہ اُن قرآنوں میں سے نہیں جن کا تحریر میں لانا حضرت عثمانؓ نے منع کر دیا تھا۔ اور جس روک کے لئے انہوں نے مستند نسخوں کے علاوہ دوسرے نسخے جلا دیئے تھے۔ ایک ہی بات تھی جو ڈاکٹر منگانا کی اس دریافت کو کچھ وقعت کے قابل ٹھیرا سکتی تھی۔ اور وہ یہ کہ اس نسخہ میں کچھ مختلف قرائتیں پائی جاتیں جن کی اجازت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس نسخہ کے اختلافات مزعومہ ان مختلف قراتوں میں سے ایک کو بھی اپنے اندر نہیں رکھتے اور اس موقعہ پر بھی وہی بات کہنی پڑتی ہے جس کو میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں کہ جو حملہ قرآن کریم کی حفاظت پر کیا گیا ہے اس کی تردید خود دوسرے معترض ہی کر دیتے ہیں۔ اگر یہ نسخہ حضرت عثمان سے پہلے کا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ اس میں اُن مختلف قراتوں میں سے کوئی قرات نہیں پائی جاتی جن کا اس وقت رواج تھا۔

ان مسودات کے کاتبوں کی ناواقفیت

جن ہاتھوں نے یہ نسخے لکھے ہیں اُن کے متعلق بھی چند الفاظ ضروری ہیں اصل مسودات تو ہمارے

سامنے نہیں ہیں۔ اور جو دو صفحات نمونہ کے دیئے گئے ہیں۔ اُنسے کافی طور پر اصل تحریر پر روشنی نہیں پڑتی لیکن جس طرح ڈاکٹر منگانا نے اُن کو پڑھ کر ہمارے سامنے رکھا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے لکھنے والے کسی قدر ناواقف ضرور ہیں۔ ڈاکٹر منگانا نے بعض باتوں کو اس وقت کی خصوصیات میں داخل کیا ہے مثلاً شئی کی جگہ شای کا لکھنا یا یوحی کی جگہ یوحا لکھنا یا اما کی جگہ ان ما لکھنا۔ قرآن کی جگہ قرن لکھنا بنالوا کی بنیللوا لکھنا اذا اننا کی جگہ اذ نا لکھنا۔ علم کی جگہ عیلم لکھنا۔ مگر یہی باتیں ناواقفیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اول تو قرآن کریم کے لکھنے کی طرز ابتدا سے ایک ہی چلی آئی ہے اور جو لفظ جس طرح پہلے کاتب نے لکھ دیا ہے اسی طرح آج تک قرآن شریف میں لکھا جاتا ہے مثلاً صلوٰۃ کو دو چار مقامات پر صلاۃ۔ قال کو بعض جگہ قل۔ پس کوئی باخبر کاتب ایسی غلطی نہ کرسکتا تھا پھر یہاں معمولی اختلاف نہیں بلکہ صاف طور پر کاتب بے خبر نظر آتا ہے ورنہ علم کو عیلم کوئی واقف کاتب نہ لکھ سکتا تھا نہ قرآن کو قرن نہ بنالوا کو بنیللوا وغیرہ۔ اسی طرح بعض وقت دو الفاظ کو جو مل نہیں سکتے ملا دیا ہے مثلاً یوم الفصل کو یوملفصل۔ یھدیھم سبیلا کو یھدیھمسبیلا۔ ھم بایتنا کو ھمبایتنا۔ ذلك الدين القيم فلا کے آخری حصہ میں القیم اور فلا کو ملا کر القیمفلا۔ لھم سوٓء اعمالھم کو لھمسواعملھم۔ فیکم سمّٰعون کو فیکمسمعون لکھ دیا ہے۔ یہ چند مثالیں ہیں۔ اسی طرح واتبعوہ کو واتبعہ لکھ دیا ہے۔ جنود کو جندا لکھ دیا ہے۔ یجادو کو یجید لکھ دیا ہے۔ الصلوۃ کو الصبلوۃ لکھ دیا ہے۔ اسی قسم کی چند مثالیں اوپر بھی آچکی ہیں جن کو ڈاکٹر منگانا نے اس وقت کی طرز تحریر کی خصوصیت قرار دیا ہے۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ مثلاً علم کو عیلم لکھنا طرز تحریر نہیں ہیں نے بطور نمونہ یہ صرف چند مثالیں دی ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ شاید اس وقت قرآن شریف میں یہ الفاظ اسی طرح لکھے جاتے ہوں یہ بالکل غلط ہے۔ قرآن کریم کی طرز تحریر میں آج تک برابر پہلی طرز تحریر کا تتبع کیا جاتا ہے مثلاً کتاب کو کتٰب ہی لکھا جاتا ہے سبحان کو سبحٰن اور اسی قسم کی صدہا مثالیں ہیں۔ بلکہ ایک لفظ جو ایک جگہ ایک طرز پر لکھا گیا ہے اور دوسری جگہ دوسری طرز پر تو اب تک اس کا برابر تتبع ہوتا ہے۔ مثلاً صلوٰۃ کا لفظ قرآن کریم میں عموماً و کے ساتھ ہی لکھا جاتا ہے مگر سورۃ الانعام کے آخر میں صلاتی لکھا ہے صلوتی نہیں لکھا حالانکہ ھود آیت ۸۹ میں صلوتك ہے صلاتك نہیں۔ اور الانعام ۹۳ میں صلاتھم ہے صلوتھم نہیں۔ اور النور۔ ۴۱ میں صلاتہ ہے صلوتہ نہیں اسی طرح سورۃ بقرہ میں ابراھیم کو ابرھم لکھا ہے لیکن دوسرے مقامات پر ابراھیم لکھا ہے یعنی یا کے ساتھ۔ قرآن کریم میں قال کا لفظ عموماً

اسی طرح الف کے ساتھ لکھا ہے۔ لیکن بعض موقعہ پر اس کو قل لکھا ہے اور اب تک اس خاص موقعہ پر اسی طرح لکھا جاتا ہے اسی قسم کی بیسیوں مثالیں ہیں۔ جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی طرز تحریر محفوظ چلی آتی ہے۔ اور اسی طرز تحریر کو چھوڑنا ناواقفیت کی علامت ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ بالکل صحیح ہے کہ اگر ڈاکٹر منگانا نے اصل الفاظ کو پڑھنے میں کوئی تصرف نہیں کیا۔ اگر حروف کے رگڑنے میں سیاہی پھیل کر یا بعض شوشے یا نقطے بالکل محو ہو کر الفاظ کی صورت بدل نہیں گئی۔ اگر اوپر والی تحریروں سے کچھ خلط اصل تحریر میں نہیں ہو گیا تو ان مسودات کے لکھنے والا کوئی جاہل آدمی تھا۔ اور یا یہ کسی عیسائی جھوٹی دینداری کا نتیجہ ہیں۔

قسم دوئم کے اختلافات

اب میں ان اختلافات کو الگ الگ لیتا ہوں۔ اور سب سے پہلے قسم دوم کے اختلافات پر بحث کرتا ہوں جن کی تعداد ۳۰ بتائی گئی ہے۔ اس میں اول تو وہ الفاظ ہیں جنہیں محض ڈاکٹر منگانا کو غلطی لگی ہے بلکہ میں کہوں گا کہ جن میں ڈاکٹر منگانا نے مغالطہ دینے کی کوشش عمداً کی ہے۔ مثلاً اس کا سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں لفظ برکنا کا اختلاف دکھانا۔ حالانکہ یہ اختلاف کوئی نہیں۔ ڈاکٹر منگانا کہتا ہے۔ قرآن کریم میں بارکنا ہے اور اسکے دریافت کردہ اوراق میں برکنا اور پھر برکنا کے معنی وہ گھٹنے ٹیکنا کرتا ہے۔ یہ محض حماقت ہے قرآن کریم کی طرز تحریر میں بارکنا نہیں لکھا جاتا۔ بلکہ اسی لفظ کو اب تک برکنا لکھا جاتا ہے۔ پرانی طرز تحریر میں اوپر کا الف نہیں لکھا جاتا تھا۔ مگر پڑھنے میں آتا تھا۔ کیونکہ قرآن کریم صرف تحریر میں محفوظ نہ تھا بلکہ ابتدا سے ہی تحریر کے ساتھ حافظوں میں بھی محفوظ تھا۔ اگر اسی قسم کے اختلاف نکالنے تھے تو ڈاکٹر منگانا کو اور بھی بہت سے اختلاف مل سکتے تھے۔ مثلاً التوبہ ۷۹ میں گو ہمارے قرآنوں میں طرز تحریر خلٰقهم اور خلٰقکم ہے مگر ان اوراق میں خلقهم لکھا ہے۔ اس کو کیوں ڈاکٹر منگانا بجائے خلاق کے خلق پڑھ کر پیدائش معنی نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ معنی تو کچھ بن بھی جاتے ہیں۔ مگر المسجد الحرام الذی برکنا حوله کے معنی کچھ بھی نہیں بنتے۔ کیونکہ اگر اس کو برکنا نہ پڑھیں برکنا پڑھیں۔ تو گویا خدا کہتا ہے کہ مسجد حرام جس کے گرد ہم نے گھٹنے ٹیکے تھے جو بالکل بے معنی فقرہ ہے۔ حالانکہ برکنا کے معنی صاف ہیں۔ کہ ہم نے برکت دی تھی۔ اسی قسم کا ایک اور فرق ہے یعنی سورہ نحل آیت ۲۲ میں ڈاکٹر منگانا کہتا ہے کہ ایان کی بجائے این لکھا ہے حالانکہ وہ درحقیقت ایّن ہے۔ تعجب ہے کہ وہی ڈاکٹر منگانا جو اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اس لکھنے والے کی طرز تحریر بھی ایسی ہے کہ وہ قرآن کو قرن لکھتا ہے وہ اس قدر موٹی بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ ایّان دوسری طرح پر بھی لکھا جاسکتا ہے یعنی ایّن اسکی

بیسیوں مثالیں اسی تحریر میں موجود ہیں۔ مثلاً تصریف الریاح کو تصریف الریح لکھا ہے۔ حالانکہ مراد الریح ہی ہے۔ اور کلماتہ کو کلمتہ لکھا ہے حالانکہ مراد کلمتہ ہے اور الاعراف ۱۴۴ میں بکلامی کو بکلمی لکھا ہے۔ اور وہیں ۱۴۲ اور ۱۴۹ میں الالواح کو الالوح لکھا ہے اور لمیقاتنا کو لمقتنا لکھا ہے وہاں ڈاکٹر منگانا نے یہ معنی کیوں نہ کر لئے کہ موسیٰ ہماری بیزاری کے لئے آئے؟ صرف اس لئے کہ یہ معنی بن نہ سکتے تھے۔ پھر جب اس لکھنے والے کی طرز تحریر ہی یہ ہے۔ اور ڈاکٹر منگانا خود اس بات کو اس کی خصوصیات میں سے بتاتا ہے۔ تو اسی طرز تحریر کی بیسیوں مثالوں میں سے ایک دو کو اختلاف کے رنگ میں پیش کر دینا محض شرارت نہیں تو اور کیا ہے

بہت سی مثالیں اسی قسم کی دی گئی ہیں کہ و کی جگہ ف یا ف کی جگہ ہے یا و یا ء کو بڑھا دیا یا چھوڑ دیا گیا ہے۔ یا یوں ہی کوئی اور چھوٹا سا فرق ہے۔ مثلاً یہ کہ سورہ الرعد ۲۶ میں اللہ کی جگہ واللہ ہے۔ لکھنے والے کو معمولی غلطی لگ گئی ہے۔ النحل ۱۷ میں افلا کی جگہ او لا ہے پتھر سے رگڑنے میں نقطہ اڑ گیا ہے اور فا۔ ل سے الگ ہو گیا ہے۔ یا یہ بھی محض غلطی ہے جو پورا یاد نہ ہونے سے لگ سکتی ہے۔ ابراہیم ۳ میں ضلال کی جگہ ضل ہے۔ میں کہتا ہوں جو شخص اذا ننا کو اذنا لکھ سکتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر منگانا نے خود مثال دی ہے اور جنوداً کو جنداً لکھ سکتا ہے۔ اور واتبعوا کو واتبعہ لکھ سکتا ہے کیا ضلال کی جگہ ضل لکھ دینا اس سے کچھ بعید ہے۔ ایسا ہی الحجر ۹۴ میں والمعرض کی جگہ واعرضن ہے جہاں ممکن ہے کہ نقطہ کسی اور کی تحریر سے زاید پڑ گیا ہے۔ پھر الرعد ۳۳ میں زین کی جگہ فزین ہے جو صریح غلطی ہے کیونکہ فزین پڑھ کر وہاں عبارت ہی نہیں بن سکتی اصل عبارت ہے بل زین للذین کفروا۔ اس کی بجائے اگر یوں پڑھیں بل فزین للذین کفروا تو یہ عربی ترکیب نہیں۔ بل اور ف دونوں میں سے ایک ہی رہ سکتا ہے۔ پھر ایک اختلاف یہ دکھایا گیا ہے کہ ہود ۲۴ میں الاخسرون کو لخسرون لکھا ہے۔ حالانکہ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ الاخسرون کو لکھنے والے نے حسب معمول اخسرون کا الف چھوڑ کر لخسرون لکھا ہے۔ اس میں سے پہلا الف چونکہ پچھلی سطر کے اخیر پر آیا ہے وہ ادھر رہ گیا ہے اور لخسرون سطر کی ابتدا میں آ گیا ہے۔ پھر وہ سطر کے آخر کا الف اڑ گیا ہے۔ اس کی مثال اس سے دو سطر اوپر ہی موجود ہے جہاں الظلمین کا الف پہلی سطر کے آخر پر ہے اور اگلی سطر کی ابتدا میں صرف لظلمین ہے یہی حال اس سے اگلے اختلاف اخبتوا اور خبتوا کا ہے۔ یہاں پہلا الف ہمزہ کی بجائے سمجھ کر لکھنے میں ترک کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس ساری طرز تحریر میں ہمزہ کہیں بھی نہیں لکھا گیا۔ یا پتھر کی رگڑ سے محو ہو گیا ہے۔ پھر ایک

اختلاف النحل ۴۸ میں فانظروا کی جگہ وانظروا لکھا ہے جو اگر غلطی نہیں تو محض ف کا نقطہ بالکل ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ اسکے بعد کی دو مثالیں جیسی التوبہ ۳۶ میں فیھن کی جگہ فیھا ہونا اور فاصابھم کی جگہ فاصابتھم ہونا محض کاتب کی غلطیاں ہیں۔

بارہواں اختلاف اور انیسواں پھر ڈاکٹر منگانا کی تعصب کے یرقان سے بیمار آنکھ کا نتیجہ ہے سورۃ توبہ آیت ۲۴ ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے واللہ لایھدی القوم الفاسقین اور آیت ۳۷ واللہ لایھدی القوم الکفرین۔ اب پڑھنے میں یھدی کی یا دونوں جگہ نہیں پڑھی جاتی۔ کیونکہ وہ القوم کے ل کے ساتھ مل جاتی ہے۔ یا تو اس خیال سے لکھنے والے نے اُسے نہیں لکھا اور یا یا ویسے ہی اڑگئی ہے بہر حال بجائے یھدی القوم کے یھد القوم ہے۔ مگر ڈاکٹر منگانا نے ناواقف پبلک کی آنکھوں میں خاک ڈالتے ہوئے اُسے ایک اختلاف عظیم ٹھیرایا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ وہ اسے لایھدا ایک لفظ لقوم دوسرا لفظ بناتا ہے۔ جہاں ل حرف جر قرار دیا ہے ھدأ یھدأ کے معنی ہیں حالت سکون میں ہونا۔ اور اس لئے معنی یوں کرتا ہے۔ کہ خدا فاسق لوگوں کی طرف (اور دوسری جگہ کافر لوگوں کی طرف) حالت سکون میں نہیں ہوگا۔ الگ اس سے کہ یہ عبارت بے معنی ہو جاتی ہے۔ جس سے شاید ڈاکٹر منگانا کو کچھ غرض نہیں کیونکہ کوئی لفظ بامعنی بن جائے سہی خواہ وہ سیاق سباق عبارت کے لحاظ سے کچھ معنی نہ دے۔ ڈاکٹر منگانا کے لئے یہی کافی ہے۔ ڈاکٹر منگانا پر بقول کسے حافظہ نباشد کی مثال صادق آتی ہے۔ کیونکہ یھدأ میں تو ہمزہ آخر میں آتا ہے۔ اور ہمزہ کے متعلق وہ تسلیم کر چکا ہے کہ اس طرز تحریر میں ہمزہ نہیں لکھا گیا۔ پھر اب ایک اختلاف بنانے کے لئے ہمزہ بھی لکھ لیا گیا۔ لیکن چلو یوں بھی مان لیں تو غالباً ڈاکٹر منگانا کے اہل زبان ہونے نے اسے اتنی مدد بھی نہ دی۔ کہ اسے یہ خیال رہتا کہ دونوں صورتوں میں قوم کی صفت الکفرین اور الفاسقین پڑی ہوئی ہے۔ اور اگر صفت پر ال ہے تو موصوف ال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ پس القوم میں ا یھدا کا حصہ نہیں بن سکتا اور نہ ل حرف جر بن سکتا ہے۔ بلکہ ال تعریفی جس طرح الفاسقین اور الکفرین کے ساتھ ہے اسی طرح موصوف القوم میں بھی ہونا ضروری ہے اس سے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر منگانا نے کس قدر اپنے مسلمات کے خلاف۔ قواعد کے خلاف اختلاف بنانے کی کوشش کی ہے جس شخص کے دل کی حالت ایسی ہو۔ وہ الفاظ اور حروف کو ایک ایسے مختلط مسودہ میں درست کس طرح پڑھ سکتا ہے۔ اور اس کی شہادت کس طرح قابل اعتبار ہو سکتی ہے۔

اس سے آگے جو اختلاف دکھایا ہے وہ بھی محض ایک مغالطہ ہے۔ بنی اسرائیل ۹۴ میں ڈاکٹر منگانا کہتا ہے انا کی بجائے اانا لکھا ہے۔ مغالطہ کے لئے ڈاکٹر منگانا، انا کو اانا لکھتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے

کہ خود کہہ چکا ہے کہ ہمزہ اس طرز تحریر میں بالکل نہیں لکھا گیا۔ اس لئے اگر وہ قرآن شریف کے لفظ کو درست طور پر ءانا لکھتا تو اس کی یہ تحریری اسکے اعتراض کا جواب ہو جاتی پس اس نے محض دھوکا دینے کیلئے ءانا کی بجائے اانا لکھ دیا ہے اور پھر اعتراض کر دیا ہے الا تعتدوا کی جگہ فلا تعتدوا (بنی اسرائیل ۲۴) ومن کی جگہ نمن (التوبہ ۲۳) معمولی اختلاف سہو کاتب سے ہے۔ یا ڈاکٹر منگانا کے پڑھنے میں غلطی ہے مثلاً اول الذکر مثال کو لے لو۔ اصل الفاظ یوں ہیں۔ وقضی ربك الا تعبدوا الا ایاہ۔ اب اگر الا کی جگہ فلا پڑھیں تو عبارت درست نہیں رہتی ہود ۳۱ میں اراکم کی جگہ ادیکم کو اختلاف بتانا بھی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ارلکم لکھا جاتا ہے۔ کاتب نے حسب معمول اوپر کا الف نہیں لکھا۔ ڈاکٹر منگانا نے اسے اختلاف ٹھیرا کر الٹ پلٹ معنی کر دیئے۔ ھود ۳۴ جادلتنا کی جگہ جادلت ممکن ہے محض آخری نا کے محو ہو جانے سے رہ گیا ہو یا کاتب کی غلطی ہو۔ المومن ۵ میں فلم يك ينفعهم کی جگہ فلم یکن نفعھم بھی اسی قبیل سے ہے۔ السجدہ ۱۱ میں فقال کی جگہ فقيل اختلاف نہیں محض دوسری طرز تحریر ہے اگر یجادد کی جگہ یحیدد اختلاف نہیں (التوبہ ۔۴۔۶) تو قال کی جگہ قیل بھی اختلاف نہیں خصوصاً اس لئے کہ قرآن کریم میں بعض جگہ قال کی بجائے قُل بھی لکھا ہے۔ ممکن ہے لکھنے والے کو اس سے غلطی لگی ہو السجدہ ۵ میں اننا کی جگہ انما صرف ننا کے دوسرے نقطہ کے نون کے دندانہ کے ساتھ مل جانے سے نما کی شکل ہو گئی ہے ورنہ اصل عبارت میں فاعمل اننا عاملون تو ایک معنی رکھتا ہے۔ کہ تو عمل کر ہم بھی عمل کرنے والے ہیں مگر فاعمل انما عملون کے کوئی معنی نہیں بنتے۔ وقال کی جگہ قال (العنکبوت ۲۴) مجعلکم کی جگہ جعلکم (النحل ۹۵) ومنا کی جگہ منا (التوبہ ۵۴) واذا کی جگہ واذ (النمل ۸) یہ سب اول حرف اور آخری سطر میں آخری حرف کے کلی محو ہو جانے کا یا محض سہو کاتب کا نتیجہ ہے اثیم کی جگہ اثم (الدخان ۴۴) طرز تحریر کا اختلاف ہے۔ کیونکہ اثیم کو اثم بھی لکھا جا سکتا ہے۔ جیسے ابراھیم کو ابرٰھم لکھا جا سکتا ہے۔ النحل ۱۱۲ میں عملت کی جگہ عملته یا اوپر کی تحریر کے خلط سے بن گیا ہے یا صریح غلطی ہے اور النمل ۸۴ میں بلی کی جگہ بل بالکل بے معنی ہے۔ اس لئے یا تو کاتب کی نرالی طرز تحریر کا نتیجہ ہے اور یا بلی میں لام اور یا کا درمیانی دندانہ محو ہو گیا ہے ایک انکار پر بلی ان اللہ علیم بما کنتم تعملون تو جواب ہو سکتا ہے لیکن بل ان اللہ علیم ترکیب کے لحاظ سے بھی درست نہیں۔ کیونکہ بل کے بعد ان نہیں چاہیئے۔

قسم اول کے اختلافات

قسم اول کے اختلافات چار ہیں۔ جن میں سے دو اختلاف ایک آیت میں تجویز کئے گئے ہیں۔ اور

بڑی چالاکی سے ایک اختلاف بنانے کے لئے دوسرا اختلاف خود تجویز کر لیا گیا ہے الجاثیہ میں انیسویں آیت یوں ہے۔ انھم لن یغنوا عنك من الله شیئا اس کی بجائے ڈاکٹر منگانا تجویز کرتے ہیں انھم لن یغنوا عنك من اللکم ھکما اس تحریر میں ڈاکٹر منگانا کا یہ دعویٰ ہے کہ شیئا کی بجائے واقعی ھکما لکھا ہوا ہے۔ مگر کیا الله کی بجائے اللکم لکھا ہوا ہے ڈاکٹر منگانا کے مسودہ کو پڑھنے سے اس سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ کیونکہ اصل مسودہ میں یہ صاف اعتراف ہے کہ لن یغنوا عنك من کے بعد کا لفظ پورا پڑھا نہیں جاتا۔ بلکہ اس کا صرف ایک حصہ اور پڑھا جاتا ہے اس کے ساتھ کم ڈاکٹر منگانا نے اپنے دماغ موجد سے تجویز کر لیا ہے۔ حالانکہ جس قدر حصہ لفظ کا پڑھا جاتا ہے وہ صاف بتاتا ہے کہ یہ لفظ الله ہے صرف آخری ہ کا دندانہ اڑا ہوا ہے۔ یہ صریح بے ایمانی نہیں تو اور کیا ہے۔ جب اصل عبارت میں الله کا لفظ موجود ہے۔ اور ایک مخلوط اور دھلے ہوئے مسودہ میں الله کا پہلا حصہ ال صاف پڑھا جاتا ہے۔ تو ایک منصف مزاج پڑھنے والا مجبور ہوگا کہ اُسے الله ہی مانے۔ مگر چونکہ ایک بے ربط لفظ ھکما کے کچھ معنی بنانے تھے۔ اس لئے صریح تحریف کر کے یہ کہہ دیا کہ الله کی بجائے اللکم ہے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ اس تحریف سے بھی ڈاکٹر منگانا کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ انھم لن یغنوا عنك من اللکم ھکما جس کے معنی ڈاکٹر منگانا نے یہ کئے ہیں۔ کہ تمسخر کرتے ہوئے وہ تیرے لئے ایک ٹکے کی جگہ نہیں لیں گے۔ خود ایک بے معنی فقرہ ہے ممکن ہے یہاری تعلیم کی دائیں گال کا تھپڑ ڈاکٹر صاحب کو یاد آ گیا ہو۔ ورنہ عبارت اس صورت میں بے معنی ہے۔ بات صرف اس قدر ہے کہ شیئا کا لفظ کچھ لفظوں اور دندانوں کی سیاہی پھیل جانے سے اور کچھ اوپر کی تحریر سے گڈ مڈ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر منگانا نے خدا جانے کتنی لغت کی کتابیں تلاش کر کے اس کو ایک بامعنی لفظ بنایا۔ یعنی ھکم جس کے معنے تمسخر کے ہیں۔ مگر چونکہ انھم لن یغنوا عنك من الله ھکما کے کچھ معنے نہ بنتے تھے۔ اس لئے کچھ تحریف سے مدد لی۔ اور الله کی بجائے اللکم لکھ دیا۔ یہ ہے اُن لوگوں کی تحقیق کی حالت۔ حالانکہ اسی قسم کا محاورہ جہاں شئی کا لفظ آخر میں آتا ہے۔ قرآن کریم میں کئی جگہ موجود ہے۔

تیسرا اختلاف قسم اول میں التوبہ کی آیت ۴۲ میں دکھایا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ وتعلم کی جگہ ومنهم ہے۔ وہاں بھی تحریف ہی ڈاکٹر صاحب کی معاون ہوئی۔ الفاظ قرآنی یوں ہیں۔ وتعلم الکاذبین۔ ڈاکٹر منگانا اپنے مسودہ میں بتاتا ہے کہ الکاذب تک تو پڑھا جاتا ہے۔ مگر آخری ین محو ہو چکے ہیں۔ اب تعلم کو منھم بنانے میں ایک دقت پیش آتی تھی۔ یعنی اگر الکاذبین

ہی پڑھا جائے تو ومنہم الکاذبین درست عبارت نہیں بنتی۔ اس لئے ڈاکٹر منگانا نے جھٹ بجائے الکاذبین کے الکاذبون بنا دیا۔ پس ان کا کذب تو خود الکاذبون کے بنانے سے ظاہر ہو گیا۔

صرف ایک مثال ایسی دی گئی ہے جہاں واقعی لفظ کی تبدیلی بتائی گئی ہے یعنی یہ کہ الاعراف ۱۵۴ میں بجائے وفی نسختہا ھدی ورحمۃ کے وفی نسختہا ھدی وسلم ہے۔ سو اگر ڈاکٹر منگانا نے اس لفظ کو تعصب کی پٹی کھول کر پڑھا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ کاتب کی صریح غلطی ہے۔ کوئی قرات ھدی وسلم کی ہمیں نہیں ملتی۔ اور قرآن کریم میں ھدی ونور یا ھدی ورحمۃ تو آیا ہے مگر ھدی وسلم کسی جگہ نہیں آیا۔

اختلافات قسم سوم

اب تیسری قسم کے اختلافات کو لیتے ہیں سب سے پہلے کہا جاتا ہے کہ النحل ۹۳ میں قرآن کریم میں ہے یضل من یشاء مگر ڈاکٹر منگانا کے نسخہ میں ہے یضل اللہ من یشاء اگر ہمارے پاس کوئی اور قرینہ نہ ہوتا تو بھی ہم کہتے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے جب تک کہ اس کی تائید کرنے والا کوئی اور نہ ہو۔ مگر یہاں تو قرینہ بھی صاف ہے کیونکہ یہاں عبارت یوں ہے ولکن یضل من یشاء ویھدی من یشاء پس اگر یضل کے بعد اللہ کا لفظ بڑھائیں تو دونوں فقروں کی موزونیت باقی نہیں رہتی۔ بہر حال کسی کاتب کے ایک لفظ زاید لکھ دینے سے یہ ثابت نہیں ہوا کرتا کہ اصل غلط ہے اور نقل درست اور نہ آج تک کسی عدالت میں اس طرح پر اصل کو غلط تسلیم کیا گیا ہے غلطی نقل کی سمجھی جائے گی۔ اور اصل کی غلطی کے لئے کوئی اور واقعات تائیدی ہونے چاہئیں جن سے غلطی کا ثبوت ملے۔

ایسا ہی التوبہ ۳۸ میں یاأیھا الذین اٰمنوا ما لکم اذا قیل لکم میں ڈاکٹر منگانا کے نسخہ کے کاتب نے الفاظ ما لکم سہواً چھوڑ دیئے ہیں۔ اس پر ڈاکٹر منگانا اچھل پڑے کہ دیکھو ثابت ہو گیا کہ اصل قرآن میں الفاظ ما لکم زاید ہیں۔ یہ اُن لوگوں کی منطق اور یہ انکا استدلال ہے۔ اس بات کا قطعی ثبوت خود اسی نسخہ سے ہمیں مل جاتا ہے۔ کیونکہ اسی سورت کی آیت ۳۳ میں ھوالذی ارسل رسولہ میں لفظ ھو کاتب نے چھوڑ دیا۔ اور پھر جیسا کہ ڈاکٹر منگانا کو اعتراف ہے یہ لفظ "حاشیہ" پر بڑھایا گیا۔ حالانکہ اصل بات صرف اس قدر ہے کہ الذی ارسل رسولہ سے چونکہ سطر شروع ہوتی ہے۔ اس لئے جو لفظ ھو ابتدا سے رہ گیا تھا وہ مجبوراً حاشیہ پر ہی جانا تھا اور ہے در حقیقت وہ ابتدائے سطر میں جہاں ہونا چاہئے۔ اب یہ بات کہ یہ مختلف ہاتھ کا ہے اگر محض اسی تعصب کا نتیجہ نہیں جس کی ہم کئی مثالیں دیکھ چکے ہیں تو بھی اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ غلطی دیکھ کر کسی نے درست کر دیا خود

کاتب نے درست نہ کیا۔ کسی دوسرے نے کر دیا۔ بہر حال معلوم ہوا کہ غلطی کو تسلیم کر لیا۔ پس اسی طرح اگر ما لکم کے لفظ رہ گئے تو کیا اندھیر آگیا۔ سہو کاتب کو اختلاف بتانا خود اس بات پر شاہد ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت پر حملہ کرنے کے لئے کن کن نکمے ہتھیاروں سے ان لوگوں کو کام لینا پڑتا ہے۔

ایک تیسرا لفظ اسی طرح رہا ہوا اسی سورت کی آیت ۳۶ میں ہے جہاں بجائے وقاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ کے یوں لکھ دیا ہے۔ وقاتلوا المشرکین کما یقاتلونکم کافۃ۔ یہاں بھی کما کا لفظ چاہتا ہے کہ جس طرح پر آخر میں کافۃ آیا ہے۔ کما سے پہلے بھی کافۃ ہو۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ تینوں آیتیں جن میں یہ تین لفظ رہ گئے ہیں۔ ایک ہی جگہ واقع ہیں۔ یعنی سورہ توبہ کی آیت ۳۳ سے لیکر ۳۸ میں ہی ہیں۔ اور ان تینوں میں سے ایک غلطی کا درست کر دینا بھی ڈاکٹر منگانا کے اعتراض کا کافی جواب ہے۔ اب اس پہلو کو ترک کر کے ہم دوسرے پہلو کو لیتے ہیں۔ کہ ان مسودات سے قرآن کریم کی حفاظت پر کس قدر مثبت نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ سوائے ان اختلافات کے جنکی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی نسخہ میں قرآن شریف سے کوئی اہم اختلاف نہیں پایا جاتا۔ تمام سورتوں میں آیتوں کی ترتیب وہی ہے جو مستند نسخہ قرآن کریم میں ہے۔ کہیں کسی آیت کی کمی بیشی نہیں کسی لفظ کی کمی بیشی نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب کی درستی پر بھی اس سے شہادت ملتی ہے۔ کیونکہ سورتیں اسی ترتیب سے لکھی ہوئی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر منگانا کے مسودہ میں صفحہ ۶۹ پر سورہ المومن ختم ہو کر اسی صفحہ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھ سورہ فصلت یا حم السجدۃ شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہی ترتیب قرآن کریم میں ہے۔ ایسا ہی صفحہ ۷۰ پر سورۃ الدخان ختم ہو کر فوراً الجاثیہ شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہی ترتیب ہمارے قرآن کریم میں ہے۔ پس یہ ایک مزید شہادت اس بات پر ہے۔ کہ سارے قرآن کریم میں سورتوں کی ترتیب میں اور ہر ایک سورۃ میں آیتوں کی ترتیب میں یا کسی کمی بیشی کے لحاظ سے قطعاً کوئی اختلاف کبھی نہیں ہوا۔

۷۔ سبعة احرف اور اختلاف قرات

اختلاف قرات سے حفاظت قرآن پر دو اعتراض

اختلاف قرات کے متعلق یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس سے دو طرح پر قرآن شریف کی حفاظت میں نقص کا ثبوت ملتا ہے۔ اول اس طرح پر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض قراتوں کی اجازت دی تھی۔ مگر چونکہ اُن کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ اس لئے اُن کے ضایع ہونے سے گویا قرآن شریف کا ایک بڑا حصہ ضایع ہو گیا۔ کیونکہ یہ قراتیں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے بذریعہ وحی بتائی تھیں۔ اور دوسرے اس طرح پر کہ اب جو مختلف قراتیں موجود ہیں اُن کو سامنے رکھکر ایک شخص کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ کہ کونسی قراتیں اصلی اور حقیقی طور پر کلام الٰہی ہیں۔ اور کہ موجودہ قرآن کریم میں یونہی ایک قرات کو اختیار کر لیا ہے یہ اعتراض ایک حدتک اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ سبعۃ احرف مذکورہ احادیث سے مراد قرآت مختلفہ لی جاتی ہیں۔ اور حرف اور قرات کے معنوں میں امتیاز نہیں کیا جاتا۔ اس لئے سب سے پہلے سبعۃ احرف کی تشریح صفائی بیان کے لئے ضروری ہے

سبعۃ احرف سے مراد

جاننا چاہئے کہ جو اجازت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعہ وحی دی تھی وہ قرآن شریف کو سبعۃ احرف یعنی سات حروف پر پڑھنے کی اجازت تھی۔ اور احادیث صحیحہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ احرف یا حرف کا ہی فرمایا ہے۔ سب سے پہلے اس لفظ کے لغوی معنوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ حرف کے معنی عربی لغاتوں میں یہ دیئے گئے ہیں۔ زبان یا محاورہ یا طرز ادا جو بعض عرب اقوام کے ساتھ مخصوص ہو۔ تاج العروس میں مشہور حدیث کے اس ٹکڑے کو کہ نزل القران علی سبعۃ احرف بیان کر کے اس کے معنوں کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ ای علی سبع لغات من لغات العرب یعنی قرآن شریف نازل ہؤا سات لغتوں پر عرب کی لغتوں سے۔ یا اس کے معنی ہیں جیسا کہ بعض دوسری لغت کی معتبر کتابوں میں دیئے گئے ہیں۔ سات طرزوں پر جو الفاظ کے ادا کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ جیسا کہ یہ کہا جائے کہ فلان یقرأ بحرف ابن مسعود تو مراد ہوتی ہے کہ فلاں شخص ابن مسعود کی طرز ادا پر پڑھتا ہے۔ لفظ حرف کے ان معنوں سے یہ ظاہر ہے کہ جن اختلافات حروف کا ذکر بعض حدیثوں میں ہے وہ اختلاف اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ عرب کی مختلف قومیں بعض وقت ایک ہی لفظ کو مختلف طور پر ادا کرتی تھیں اور اس کی مثالیں ہر زبان میں موجود ہیں۔ کہ ایک قوم ایک لفظ کو ایک طرح پر ادا کرتی ہے۔ اور اسی ملک کی دوسری قوم اسی لفظ کو دوسری طرح پر ادا کرتی ہے +

اختلاف حروف والی احادیث

اب ہم ان تمام احادیث کو جن میں اختلاف حروف کا ذکر آیا ہے بیان کرتے ہیں۔ تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ آیا واقعی طور پر احادیث کا بھی یہی منشا ہے۔ اس کے متعلق مندرجہ ذیل احادیث معتبر کتب احادیث سے لی گئی ہیں۔

۱۔ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اقرانی جبریل علی حرف فراجعتہ فلم ازل استزیدہ ویزیدنی حتی انتھی الی

سبعۃ احرف (بخاری) ابن عباس رضی اللہ عنہمانے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبریل نے مجھے قرآن شریف ایک حرف کے مطابق پڑھایا میں نے اس سے مراجعت کی یعنی بار بار اس بات کو دوہرایا کہ زیادہ حروف میں پڑھے۔ پس وہ تعداد کو بڑھاتا گیا یہاں تک کہ سات پر پہنچ گیا۔ یہی حدیث انہی الفاظ کے ساتھ مسلم نے بیان کی ہے۔ مگر اس میں اتنے الفاظ ابن شہاب کی روایت سے اور زیادہ ہیں۔ قال ابن شهاب بلغنی تلك السبعة الاحرف انما هی فی الامر یکون واحدا لا یختلف فی حلال ولا حرام۔ یعنی ابن شہاب نے کہا کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ یہ سات حروف ایسے امر میں ہیں جو ایک ہی ہے (یعنی مختلف حروف میں پڑھنے سے معنوں میں کوئی تغیر نہیں آتا) اور اس سے حلال اور حرام میں کوئی فرق نہیں آتا۔

۲۔ عن عمر بن الخطاب یقول سمعت هشام بن حکیم یقرأ سورة الفرقان فی حیاة رسول الله صلی الله علیه وسلم فاستمعت لقرأته فاذا هو یقرأ علی حروف کثیرة لم یقرئنیها رسول الله صلی الله علیه وسلم فکدت اساوره فی الصلوة فتصبرت حتی سلم فلببته بردائه فقلت من اقرأك هذه السورة التی سمعتك تقرء قال اقرأنیها رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلت کذبت فان رسول الله صلی الله علیه وسلم قد اقرأنیها علی غیر ما قرأت فانطلقت به اقوده الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلت انی سمعت هذا یقرأ بسورة الفرقان علی حروف لم تقرئنیها فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم ارسله اقرأ یا هشام فقرأ علیه القرأة التی سمعته یقرأ فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم کذلك انزلت ثم قال اقرأ یا عمر فقرأت القرأة التی اقرأنی فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم کذلك انزلت ان هذا القرآن انزل علی سبعة احرف فاقرؤا ما تیسر منه (بخاری) قریباً انہی الفاظ میں یہ روایت صحیح مسلم میں بھی آئی ہے۔ ماحصل اس حدیث شریف کا یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں میں نے ہشام بن حکیم کو سورۃ فرقان پڑھتے سُنا۔ جب میں اس کے پڑھنے کو غور سے سننے لگا۔ تو میں نے معلوم کیا کہ وہ بہت سے ایسے حروف پر پڑھتا ہے جن پر رسول اللہ صلعم نے مجھکو نہیں پڑھایا۔ قریب تھا کہ میں نماز ہی میں اسپر حملہ کرتا۔ مگر میں نے اپنے آپکو روکے رکھا۔ یہانتک کہ ہشامؓ نے سلام پھیرا پھر میں نے اُنکی چادر اُنکے گلے میں ڈال لی اور کہا کہ یہ سورۃ جو میں نے تمہیں پڑھتے سنا ہے کس نے تمکو پڑھائی انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھکو پڑھائی۔ میں نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو۔ رسول صلی اللہ

اللہ علیہ وسلم نے مجھے ان حروف کے غیر پر پڑھایا جن پر تم پڑھتے ہو۔ پھر میں اُن کو اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لیکر چلا گیا۔ اور عرض کی کہ میں نے ان کو یعنی ہشام کو ایسے حروف پر سورۃ فرقان پڑھتے سنا ہے۔ جن پر آپ نے مجھ کو نہیں پڑہایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انہیں چھوڑ دو۔ اور فرمایا ہشام تم پڑہو۔ انہوں نے وہی قرات پڑھی جو میں نے انہیں پڑھتے سُنا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسی طرح پر یہ نازل ہوئی۔ پھر فرمایا۔ اے عمرؓ تم پڑہو۔ میں نے اسی طرح پڑھا جس طرح آپ نے مجھے پڑہایا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسی طرح یہ نازل ہوئی ہے۔ یہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔ پس جو تم پر آسان ہو پڑھو +

۳۔ عن ابن مسعود قال سمعت رجلا یقرأ وسمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ خلافہا فجئت بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاخبرتہ فعرفت فی وجہہ الکراہیۃ فقال کلاکما محسن فلا تختلفوا فان من کان قبلکم اختلفوا فہلکوا (بخاری) ابن مسعود فرماتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو قرآن شریف پڑھتے سنا۔ اور میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور طرح پڑھتے سنا تھا۔ پس میں اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آیا۔ اور آپ کو اس بات کی خبر دی۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے چہرہ پر ناراضگی کے آثار ہیں۔ آپ نے فرمایا تم دونوں ٹھیک پڑھتے ہو۔ پس اختلاف مت کرو۔ کیونکہ جو تم سے پہلے گذرے ہیں۔ انہوں نے اختلاف کیا۔ تو ہلاک ہو گئے۔

۴۔ عن ابن ابی کعب قال کنت فی المسجد فدخل رجل یصلی فقرأ قراءۃ انکرتہا علیہ ثم دخل اخر فقرأ قراءۃ سوی قراءۃ صاحبہ فلما قضینا الصلوۃ دخلنا جمیعًا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت ان ھذا قرأ قراءۃ انکرتہا علیہ ودخل اخر فقرأ سوی قراءۃ صاحبہ فامرھما النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقرأ فحسن شانہما فسقط فی نفسی من التکذیب ولا اذ کنت فی الجاہلیۃ فلما رای رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما قد غشینی ضرب فی صدری ففضت عرقا وکانما انظر الی اللہ فرقًا فقال لی یا ابی ارسل الی ان اقرء القرآن علی حرف فرددت الیہ ان ھوّن علی امتی فردّ الی الثانیۃ اقرءہ علی حرفین فرددت الیہ ان ھوّن علی امتی فرد الی الثالثۃ اقرءہ علی سبعۃ احرف (مسلم) ابی بن کعب کہتے ہیں کہ میں مسجد میں تھا تو ایک آدمی آیا اور نماز پڑھنے لگا۔ اور اس نے قرأت پڑھی جس پر میں نے اعتراض کیا۔ پھر ایک اور آدمی آیا اور اس نے پہلے سے بھی اختلاف کے ساتھ قرات پڑھی۔ جب ہم نماز سے فارغ ہو چکے تو ہم سب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میں نے عرض کیا کہ اس شخص نے ایک قرأت پڑھی جس کے متعلق میں نے اس پر اعتراض کیا پھر دوسرا شخص آیا تو اس نے اس سے بھی مختلف قرات پڑھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو حکم دیا اور انہوں نے پڑھ کر سنایا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی قرأت کو پسند فرمایا اس پر میرے دل میں ایک ایسا تکذیب کا خیال یکایک گذرا کہ جاہلیت میں بھی ایسا خیال نہ گذرا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ کیسا وسوسہ میرے دل میں گذرا ہے تو آپ نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور میرا پسینہ چلنے لگا۔ گویا مارے خوف کے میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر آپ نے فرمایا اے ابی مجھے یہی حکم دیا گیا تھا کہ ایک ہی حرف پر قرآن کو پڑھوں پھر میں نے اس بات کو لوٹایا۔ اور عرض کیا کہ میری امت پر آسانی کی جاوے۔ پھر دوبارہ مجھے یہ فرمایا گیا کہ دو حرفوں پر پڑھو۔ میں نے پھر اس بات کو لوٹایا اور عرض کیا کہ میری امت پر آسانی کیجاوے پھر تیسری مرتبہ مجھے اجازت دی گئی کہ سات حرفوں پر پڑھ لو۔

۵۔ عن ابی بن کعب قال لقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل فقال یا جبرئیل انی بعثت الی امة امیین منهم العجوز والشیخ الکبیر والغلام والجاریة والرجل الذی لم یقرأ کتابا قط قال یا محمد ان القرآن انزل علی سبعة احرف (ترمذی) ابی بن کعب سے روایت ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل سے ملے اور فرمایا اے جبرئیل میں امّی لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ جن میں بوڑھی عورتیں اور بوڑھے مرد اور لڑکے اور لونڈیاں اور ایسے آدمی ہیں جنہوں نے کبھی کتاب نہیں پڑھی۔ جبرئیل نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے۔

۶۔ عن ابی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان عند اضاة بنی غفار فاتاہ جبرئیل فقال ان اللہ یامرک ان تقرئ امتک القرآن علی حرف الحدیث (مسلم) مسلم کی اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سات حروف پر پڑھنے کی اجازت ملی تو آپ اضاة بنی غفار کے پاس تھے۔ باقی حدیث کا وہی مطلب ہے جو پہلے بیان ہوا۔

۷۔ عن جابر قال خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن نقرأ القرآن وفینا الاعرابی والعجمی فقال اقرؤا فکل حسن وسیجیئ اقوام یقیمونه کما یقام القدح یتعجلونه ولا یتاجلونه (ابوداؤد) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر آنکلے اور ہم قرآن پڑھ رہے تھے۔ اور ہمارے درمیان اعرابی اور عجمی لوگ تھے

آپ نے فرمایا پڑھتے جاؤ سبھی ٹھیک پڑھ رہے ہیں۔اس کے بعد ایسی قومیں آئیں گی جو قرآن کو بڑی صفائی سے پڑھیں گی ایسی صفائی سے جیسا کہ تیر سیدھا کیا جاتا ہے۔مگر وہ اس کا اجر اسی زندگی میں تلاش کریں گی اور عاقبت کی پروا نہیں کریں گی۔

سات حروف پر قرآن پڑھنے کی اجازت کب ہوئی

یہ چند احادیث ہیں جو قرات مختلفہ کے متعلق آئی ہیں ایک بات جس پر ان ساتوں حدیثوں سے متفقہ شہادت ملتی ہے یہ ہے کہ جو کچھ اختلاف تھے وہ قرآن کریم کی عبارت کے اختلاف نہ تھے۔بلکہ بعض الفاظ کو مختلف طور پر پڑھنے یا ادا کرنے کے اختلاف تھے۔اس بات کو صاف کرنے کے لئے ان چند امور کو جو ان احادیث سے پیدا ہوتے ہیں ایک ایک کر کے زیر بحث لانا ضروری ہے۔سب سے پہلے جو اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور جس سے قطعی شہادت ان اختلافات کی حقیقت کے متعلق ملتی ہے وہ وقت کا سوال ہے یعنی اس امر کی تحقیق کرنا کہ سات حروف میں قرآن شریف کو پڑھنے کی اجازت کس وقت دی گئی۔پس ان احادیث کو آگے رکھکر ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ آیا سات حروف میں قرآن شریف کا نزول ابتدا سے ہی تھا۔یا کسی خاص وقت کسی خاص ضرورت کے لحاظ سے اجازت حروف مختلفہ میں ادا کرنے کی بعد میں دی گئی۔کیونکہ اگر جب سے نزول قرآن شریف کا شروع ہوا اسی وقت سے سات حروف میں اس کا نزول تھا تو اس میں ایک معترض کو اس اعتراض کی گنجایش نکل سکتی ہے کہ وہی سات حروف ہمیشہ کے لئے چلے آنے چاہئیں تھے۔اور اگر وہ ساتوں حروف ہم تک نہیں پہنچے تو اس سے یہ نتیجہ نکلیگا کہ کچھ قرآن شریف کا حصہ ضایع ہو گیا۔لیکن اگر سات حروف کا نزول بعد میں ہوا اور ابتداً قرآن شریف کا نزول ایک ہی حرف میں تھا تو ایسا اعتراض کسی صورت میں ہو ہی نہیں سکتا۔کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سات حروف میں نزول کسی خاص ضرورت کی وجہ سے ہوا اور ان سات حروف کو اصل قرآن شریف سے جیسا کہ وہ ابتدا سے نازل ہو رہا تھا کچھ تعلق نہیں۔بلکہ بعض ضرورتوں کی وجہ سے ایک وقت کیلئے بعض لوگوں کو ایسی اجازت دی گئی۔

استدلال اول زمانہ اجازت حروف کے متعلق چھٹی حدیث سے پیدا ہوتا ہے جس میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اضاۃ بنی غفار کے قریب تھے۔جب آپ کو سات حروف پر قرآن شریف پڑھنے کی اجازت دی گئی۔اضاۃ بنی غفار ایک مشہور مقام مدینہ میں ہے۔پس زمانہ کے متعلق اس قدر تو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔کہ مختلف حروف کی اجازت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد ہوئی۔اس طرح مکہ میں جسقدر قرآن شریف آنحضرت پر نازل ہوا وہ ایک ہی حرف پر نازل ہوا۔اور یہ ایسا قطعی اور یقینی نتیجہ ہے کہ کوئی دلیل اسے توڑ نہیں سکتی۔مگر یہ امر کہ مدینہ میں کس وقت یہ اجازت ملی اس کی اس حدیث سے کچھ تعیین نہیں ہو سکتی لیکن ایک اور حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ در اصل یہ اجازت اس وقت دی گئی جب فتح مکہ

کے بعد کثرت سے عرب لوگ اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے اور مختلف قوموں کو قرآن کریم کے سکھانے کی ضرورت پیش آئی جس سے اس اجازت کا زمانہ ہجرت نبوی کا نواں سال قرار پاتا ہے۔ یہ حدیث وہ ہے جس کو بخاری اور مسلم دونوں نے قریباً یکساں لفظوں میں بیان کیا ہے اور جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ہشام بن حکیم کے اختلاف کا ذکر ہے۔ حضرت عمر نے ہشام کو قرآن شریف کی ایک سورۃ پڑھتے سنا اور آپ اس کے پڑھنے سے بہت حیران ہوئے کیونکہ اس میں اُن کی قرات سے جو ہمیشہ سے حضرت عمر پڑھتے اور سنتے چلے آئے تھے بعض اختلافات تھے۔ جس تعجب سے حضرت عمر نے حضرت ہشام کی اس قرات کو سنا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ پہلا ہی موقعہ تھا جو حضرت عمر کو قرات میں ایسے اختلاف کے سننے کا موقعہ ہوا۔ اب تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ہشام فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے۔ پس اُن کا سورۃ فرقان جیسی لمبی سورۃ پڑھنا اس کے بھی کچھ عرصہ بعد کا واقعہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ مسلمان ہوتے ہی وہ ایک آدھ دن میں اتنی اتنی لمبی سورتیں یاد نہ کر سکتے تھے۔ کہ نمازمیں انہیں پڑھنا شروع کر دیں۔ پس اس قدر تو یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ یہ واقعہ جس کا حدیث میں ذکر ہے فتح مکہ کے بعد کا ہے۔ اور اس کا زمانہ نویں سال ہجرت سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔ اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ سات حروف میں پڑھنے کی اجازت برسوں پہلے ہو چکی ہو مثلاً آنحضرت کی مدنی زندگی کے ابتدا میں ہی ہو چکی ہو؟ یہ بات ظاہر ہے کہ جب ایسی اجازت ملی ہو اسی وقت سے اس پر عمل بھی شروع ہو گیا ہو۔ اور اگر مثلاً اجازت ابتدائے مدنی زندگی میں ہی مل گئی ہو اور اس پر عمل نو سال بعد تک نہ ہوا ہو تو اس میں اور اس صورت میں کہ اجازت ہی نویں سال ہجری میں ملی ہو کچھ فرق نہیں۔ پس اب تحقیق طلب یہ امر ہے کہ آیا یہ ممکن ہے کہ قرآن شریف سات حروف پر تو ابتدائی زندگی مدنی سے ہی پڑھا جاتا ہو؟ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر نہ ہوئی ہو؟ اگر حضرت عمر عرب کے کنارے کی قوموں میں سے ایک شخص ہوتے اور ایک آدھ دفعہ آنحضرت کے پاس تشریف لا کر پھر اپنے گھر میں چلے گئے ہوتے تو یہ ممکن تھا کہ اجازت سات حروف کی مدت سے مل چکی ہو اور اُن کو اطلاع نہ ہوئی ہو۔ مگر حضرت عمر دن رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے والے تھے۔ اور اگر کبھی اپنے کاروبار بھی کرتے تھے اور غیر حاضری کا اتفاق ہو جاتا تو آپ نے یہ انتظام کیا ہوا تھا کہ ایک اپنے ہمسائے کو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیتے جو آپ کو تازہ وحی اور نئے امور سے اطلاع دیدیتے۔ پس ایسے شخص کے متعلق یہ کسی صورت میں خیال نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اگر سات حروف میں پڑھنے کی اجازت مل گئی ہو اور اس پر عملی بھی شروع ہو گیا ہو تو وہ برسوں یا مہینوں اس سے بیخبر رہے ہوں۔

ان تمام واقعات پر غور کر کے ہم اس یقینی اور قطعی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ سات حروف میں پڑھنے کی اجازت نویں سال ہجرت کے قریب ہوئی۔ جب عرب کی مختلف قومیں کثرت کے ساتھ اسلام میں داخل ہونی شروع ہوئیں اور اس سے پہلے یہ اجازت نہ تھی یا اگر اجازت تھی تو اس پر قطعاً عمل نہیں ہوا۔ یعنی فی الواقع قرآن شریف کا مختلف حروف پر پڑھا جانا فتح مکہ سے پہلے ثابت نہیں ہے اور جس قدر حدیثیں اسکے متعلق آئی ہیں ان سے اشارتاً اور کنایتاً بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ فتح مکہ سے پہلے قرآن شریف سات حروف پر پڑھا گیا ہو۔ چنانچہ جن لوگوں نے سبعۃ احرف پر بحث کی ہے خواہ وہ کسی نتیجہ پر پہنچے ہوں مگر اس امر کے وہ قایل ہیں کہ یہ اجازت اس وقت ملی جب عرب کثرت کے ساتھ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اور یہ فتح مکہ سے بعد کا زمانہ ہے۔

اکیس سال تک قرآن شریف ایک ہی حرف پر لکھا اور پڑھا جاتا رہا

اس ساری بحث سے ایک اہم نتیجہ پیدا ہوتا ہے جس سے سبعۃ احرف کی حقیقت پر ایسی روشنی پڑتی ہے کہ کسی شک و شبہ کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ تیرہ سال مکہ میں اور آٹھ سال سے زیادہ مدینہ منورہ میں یعنی اکیس سال تک قرآن شریف ایک ہی حرف پر نازل ہوا اور ایک ہی طرز پر پڑھا جاتا رہا اور ایک ہی طرح پر لکھا جاتا رہا۔ نہ کوئی اختلاف تھا اور نہ قرآن شریف کی کسی عبارت میں مختلف حروف کا وجود تھا۔ یہی اصل قرآن شریف ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ساری عمر پڑھتے رہے پڑھاتے رہے۔ یہی وہ قرآن شریف ہے جسے حضرت ابوبکر نے تحریر میں جمع کرایا۔ یہی وہ قرآن شریف ہے جس کی نقلیں حضرت عثمان نے اطراف میں بھیجیں۔ اور یہی وہ قرآن شریف ہے جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے جس طرح اکیس سال تک کسی دوسرے حرف یا قرات کا وجود نہ تھا اسی طرح اس قرآن شریف میں جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اور وہ ایک ہی قرآن شریف ہے جو ساری اسلامی دنیا میں شایع ہو رہا ہے اسمیں بھی نہ کوئی اختلاف قرات ہے نہ اختلاف حروف ہے بالفاظ دیگر اسکی عبارت وہی عبارت ہے جو اکیس سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں پڑھی جاتی تھی پس جو قراتیں چھوڑی گئیں وہ اصل میں قرآن شریف کا جزو نہ تھیں بلکہ ایک خاص وقت اور ایک خاص ضرورت کیلئے یہ اجازت دی گئی تھی اس کے متعلق میں اور شہادتیں بھی پیش کروں گا۔ مگر جہاں تک زمانہ اجازت کے سوال سے کوئی نتیجہ پیدا ہو سکتا ہے اس سے صاف اس امر کی شہادت ملتی ہے۔ کہ اکیس سال تک مختلف حروف اور قراتوں کا سوال ہرگز نہیں اٹھا۔ ایک ہی حرف پر قرآن شریف نازل ہوتا تھا اور ایک ہی قرات تھی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس اکیس سال کے زمانہ میں قرآن شریف کا بہت بڑا حصہ نازل ہو چکا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ قریباً قریباً سارا ہی قرآن شریف نازل ہو چکا تھا پس ایک ایسے وقت میں جب کہ مختلف اقوام کثرت کے ساتھ دین اسلام میں داخل ہونی شروع ہوئیں مختلف حروف میں قرآن شریف کے پڑھنے کی اجازت

دینا صاف بتا رہا ہے کہ یہ اجازت صرف انہی قوموں کی وجہ سے تھی۔ اور اس سے اصل عبارات قرآنی میں کوئی تغیر و تبدیل نہیں ہوا۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ اختلافات حروف عبارتوں یا جملوں کے اختلاف نہ تھے بلکہ ایسے اختلاف تھے جو ایک ہی لفظ کے بولنے میں مختلف قوموں کے درمیان پیدا ہونے لازمی ہیں۔ یہ قومیں زبان تو عربی ہی بولتی تھیں مگر جیسا کہ ہر ایک زبان کا قاعدہ ہے خصوصاً جہاں علم کا عام رواج نہ ہو اور لوگ پڑھے ہوئے نہ ہوں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر اصل محاورہ سے کچھ فرق پڑ جاتا ہے ایسا ہی ان قوموں کے محاورہ میں یعنی بعض الفاظ کو ادا کرنے کے طریق میں تھوڑا تھوڑا فرق تھا۔ ایسے اختلافات کی بعض مثالیں پہلے بھی بیان ہو چکی ہیں۔ مثلاً لفظ حتّٰی جو اصل لفظ ہے اور محاورہ قریش کے مطابق ہے اسے ثقیف اور ہذیل عتّٰی پڑھتے تھے۔ ایسے ہی اور بعض اختلافات کی مثالیں دی گئی ہیں۔ (دیکھو فتح الباری) مثلاً اسدی تعلمون ت کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے تھے بعض قومیں ماغیر اٰسن کی جگہ ماغیر یاسن پڑھتی تھیں۔ اور ایسا ہی بعض قومیں ایسے الفاظ میں ہمزہ پڑھتی تھیں۔ جہاں دوسری نہ پڑھتی تھیں یہ سارے ایسے فرق ہیں جو ہر جگہ پر اور ہر زبان میں اختلاف محاورہ سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

اسی کی تائید میں بعض اور شہادتیں بھی ہیں۔ جیسا کہ فتح الباری میں یہ مذکور ہے ونقل ابوشامة عن بعض الشیوخ انه قال انزل القرآن اولا بلسان قریش ومن جاورهم من العرب الفصحاء ثم ابیح للعرب ان یقروه بلغاتهم التی جرت عادتهم باستعمالها علی اختلافهم فی الالفاظ والاعراب ولم یکلف احد منهم الانتقال من لغته الی لغة اخری للمشقة ولما کان فیهم من الحمیة ولطلب تسهیل فهم المراد کل ذلك مع اتفاق المعنی یعنی ابوشامہ نے ایک بزرگ سے یہ نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ اول نزول قرآن کریم کا زبان قریش میں اور اُن فصیح عربوں کی زبان میں تھا جو اُن کی ہمسائیگی میں رہتے تھے۔ پھر دوسری عرب قوموں کے لئے یہ اجازت دی گئی کہ اسے اپنی لغات یعنی محاورہ میں جس کے استعمال کے وہ شروع سے عادی تھے پڑھ لیا کریں۔ بوجہ اُن کے اختلاف کے الفاظ میں اور اعراب میں اور ان میں سے کسی کو اس بات پر مجبور نہ کیا گیا کہ وہ اپنے محاورہ کو چھوڑ کر دوسروں کا محاورہ اختیار کرے۔ اس لئے کہ ایسا کرنا اُن کے لئے بہت دشوار تھا۔ اور ان میں اپنے اپنے محاوروں کے لئے حمیت بھی تھی اور اس سے معنوں کے سمجھنے میں بھی اُنکے لئے آسانی تھی۔ اور یہ سب کچھ اتفاق معنی کیساتھ تھا۔ یعنی یہ اختلاف محاورہ اُن کے ایسے نہ تھے جن سے معنوں میں کچھ بھی فرق پڑتا ہو۔ یہ حوالہ بھی ہمارے اس نتیجہ کا موید ہے جو زمانہ اجازت قرات حروف مختلفہ سے پیدا ہوتا ہے۔

اگر ان احادیث پر جو اوپر سبعة احرف کے متعلق نقل کی گئی ہیں غور سے نظر کی جاوے تو ان سے

بعد کا اختلاف صرف طرز ادا میں تھا

اجازت کی غرض صرف سہولت دینا تھا

بھی اس بات کا پتہ لگتا ہے کہ اس اجازت کے دینے کی غرض کیا تھی۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ھون علی امتی میری امت پر آسانی کر جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ آپ محسوس کرتے تھے کہ بعض لوگوں کو قریش کے محاورہ میں سارے الفاظ ادا کرنے میں مشکلات پیش آتی ہیں اُن کے لئے آسانی کی درخواست کی کہ وہ اپنے محاورہ میں ہی ان الفاظ کو ادا کر لیں۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا ان امتی لا تطیق ذٰلك یعنی میرے لوگ اس بات کی برداشت نہیں کر سکتے کہ وہ سب ایک ہی حرف میں قرآن شریف کو پڑھ سکیں۔ ایک تیسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا اُن لوگوں میں بعض بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں اور بچے اور ناخواندہ لوگ ہیں غرض یہ تھی کہ لوگ ایسے اپنے محاورہ کے عادی ہو گئے ہیں کہ دوسرے محاورہ میں الفاظ ادا نہیں کر سکتے۔ جس طرح ایک لفظ بولنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اسی طرح پر اُسے بول سکتے ہیں۔ اگر وہ تعلیمیافتہ ہوتے تو قریش کی فصیح اور علمی زبان میں ہر ایک لفظ کو آسانی سے ادا کر سکتے۔ مگر چونکہ امّی لوگ تھے ایسا نہ کر سکتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو تکلیف میں نہ ڈالا۔ بلکہ یہ اجازت دی کہ جس طرح وہ کسی لفظ کو بولنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اسی طرح پڑھ لیا کریں۔ اور بخاری کی حدیث کے آخری الفاظ میں فاقرءوا ما تیسر منه یعنی جس طرح پر تمہارے لئے آسانی ہو اسی طرح پڑھ لیا کرو۔ اس سے بھی وہی نتیجہ نکلتا ہے۔ پھر ایک پانچویں حدیث میں ہے کہ اعرابی اور عجمی سب لوگ قرآن پڑھ رہے تھے اور آپ نے فرمایا سب ہی خوب پڑھ رہے ہیں۔ اور ایک ایسی قوم کی مذمت کی جو لفظوں کو تو بہت سنوار سنوار کر ادا کریں گے مگر معنوں تک نہیں پہنچیں گے۔

ایک اور بات جس سے سبعہ احرف کی بحث پر روشنی پڑتی ہے یہ ہے کہ جو لوگ ابتدائے اسلام میں مشرف باسلام ہوئے تھے اُن میں اس قسم کے اختلافات کا کچھ تذکرہ نہیں پایا جاتا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم میں کوئی اختلاف قرات نہیں دکھایا جا سکتا۔ مسلمانوں میں سے سابقین کے اندر ایسے اختلافات کا نہ پایا جانا بھی صاف طور پر یہی بتا رہا ہے کہ اجازت مختلف حروف میں پڑھنے کی خاص اغراض کے لئے تھی۔ اور اس سے اصل عبارت قرآنی میں کوئی تغیر تبدل نہیں ہوا۔ قرآن کریم کا نزول لسانِ قریش میں ہوا کیونکہ انہی کی زبان علمی طور پر از فصاحت وبلاغت سمجھی جاتی تھی۔ دوسری قوموں کے محاورے محض اس اصل زبان کا کسی کسی لفظ میں بگاڑ تھا۔ مگر ان لوگوں کے لئے جو ایسے الفاظ کو اپنی قوم کے محاورہ کے مطابق ادا کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ ان الفاظ کو زبان قریش کے محاورہ میں ادا کرنا بہت مشکل تھا اور چونکہ ہر ایک

مسلمان کیلئے کچھ نہ کچھ حصہ قرآن کریم کا جاننا ضروری تھا۔ خواہ وہ خواندہ ہو یا ناخواندہ اور خواہ بوڑھا ہو یا بچہ۔ کیونکہ نماز ہر ایک مسلمان پر فرض تھی اور نماز میں قرآن شریف لازمی طور پر پڑھا جاتا تھا۔ اس لئے اُن لوگوں کو جو یکایک اپنے محاوروں میں اس قسم کا تغیر پیدا کرنے کے ناقابل تھے کہ ہر ایک لفظ کو صحیح طور سے قریش کے محاورہ پر ادا کر سکیں یہ اجازت دی گئی جس کی بناء وحی الٰہی پر تھی کہ وہ بعض الفاظ کو اسی طور پر ادا کر لیں جس طرح اپنے محاورہ میں کرتے تھے۔

اختلافات حروف نہایت خفیف تھے

یہ سوال کہ مختلف محاورات یا لغتیں محاورۂ قریش سے اور آپس میں کس قدر مختلف تھیں اب اس پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن جیسا کہ کئی مثالیں دیکر پہلے بھی بیان کیا گیا ہے یہ اختلافات نہایت خفیف تھے تاریخی شہادت جہاں تک میسر آسکتی ہے وہ بھی اس نتیجہ کی مؤید ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے ہم اس سے بھی انکار نہیں کرتے کہ جیسا کہ ایسے محاورات میں بعض اوقات ہو جاتا ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کا قائمقام دوسرے محاورہ میں کوئی اور لفظ ہوتا ہے۔ اس لئے جب قرآن کریم کو دوسرے حروف پر یعنی دوسرے محاوروں کے مطابق پڑھنے کی اجازت دی گئی ہوگی۔ تو اس طرح سے کسی لفظ کو دوسرے محاورہ میں اُس کے ہم معنی لفظ سے ادا کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی ہوگی۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ مختلف حروف سے مراد ایک معنی کو مختلف الفاظ سے ادا کرنا ہے۔ اگرچہ یہ انہوں نے محض قیاس سے لکھا ہے اور حضرت عمرؓ اور ہشام والی حدیث سے دھوکہ کھایا ہے لیکن ممکن ہے کہ ایسی کوئی مثال بھی اُن کے ذہن میں ہو۔ کہ ایک محاورہ میں ایک لفظ کو دوسرے محاورہ میں اس کے ہم معنی لفظ سے جہاں پہلا لفظ اس دوسرے محاورہ میں موجود نہ ہو ادا کرنے کی اجازت دی گئی۔ اور اس سے انہوں نے ایک عام قاعدہ بنا لیا۔ علاوہ ان مثالوں کے جو اوپر بیان ہوئیں اور ظاہر کر رہی ہیں کہ اختلافِ احرف عموماً نہایت خفیف اختلاف تھے جو بعض الفاظ کو خاص طرز پر ادا کرنے کی وجہ سے یا اعراب میں کسی قدر فرق کی وجہ سے پیدا ہوتے تھے خود قیاس بھی اس بات کو چاہتا ہے کہ یہ اختلاف ایسے ہی معمولی اختلاف تھے جیسے ایک ہی ملک کے رہنے والے اور ایک ہی زبان کے بولنے والے لوگوں میں بعض وقت پائے جاتے ہیں۔ آخر ان سب قوموں کی زبان عربی ہی تھی اور اسی زبان میں وہ شعر کہتے تھے۔ جن میں باہم ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے تھے اور باہمی ان کا میل جول بھی بہت ہوتا تھا اور میلے لگا کرتے تھے۔ جہاں وہ سب اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ یہ سب باتیں اسی نتیجہ کی مؤید ہیں۔ کہ اختلاف احرف نہایت خفیف قسم کے اختلافات تھے۔

اعتراض اس پر یہ کیا گیا ہے کہ اگر واقعی یہ اختلاف ایسے ہی خفیف ہوتے تو صحابہ ان اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر سختی کیوں کرتے۔ جیسا کہ مثلاً حضرت عمرؓ کے متعلق حدیث میں مذکور ہے کہ انہوں نے اول تو نماز میں ہی ہشام کو روکنا چاہا اور پھر آخر اُن کی گردن میں چادر ڈال کر اُنکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں لے گئے اور جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم نہیں دیا تب تک انہیں چھوڑا نہیں۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ عمرؓ اور ہشام کی قرأت میں کوئی بہت بھاری اختلاف ہوگا۔ جس سے معنوں میں بھی تغیر آتا ہوگا۔ جو حضرت عمرؓ نے ہشام کے ساتھ اس قدر سختی کا برتاؤ کیا۔ جیسے کسی بڑے مجرم کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بلکہ بعض نادان یا مجنون معترض تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں کہ ہشام کی قرأت حضرت عمرؓ کی قرأت سے اس قدر اختلاف رکھتی تھی کہ دونوں گویا الگ الگ عبارتیں تھیں۔ اگر درحقیقت ایسا ہوتا تو حضرت عمرؓ کو یہ کیونکر پتہ لگ گیا کہ حضرت ہشام سورہ فرقان پڑھ رہے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے اُن کی قرأت کو سنتے ہی پہچان لیا۔ رہی یہ بات کہ اس قدر اختلاف تھا جس سے معنوں میں بھی اختلاف ہوا ہوگا ورنہ حضرت عمرؓ سختی نہ کرتے۔ یہ قیاس بھی غلط ہے۔ کیونکہ احادیث میں صریح طور پر یہ الفاظ موجود ہیں کہ یہ اختلاف قرأت ایسا نہ تھا جس سے معنوں میں بھی کچھ اختلاف ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن شریف کے ایک ایک لفظ اور حرف اور حرکت کے لئے ایسے محتاط تھے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ فرق کو بھی وہ برداشت نہ کر سکتے تھے انہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ قرآن شریف کے معنی سمجھ لینے ہی کافی ہیں بلکہ وہ اس کے الفاظ اور حروف اور حرکات کو منجانب اللہ سمجھ کر اور خدا کا کلام یقین کر کے محافظت کرتے تھے۔ پس وہ اس قدر ادنیٰ اختلاف کو بھی جو اختلاف حروف سے پیدا ہوا برداشت نہ کر سکتے۔ جب تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے سن نہیں لیا کہ یہ اجازت محض ایک ضرورت کیلئے دی گئی ہے۔ انہوں نے صبر نہ کیا جب تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو یہ نہ سمجھا دیا کہ اُن قوموں کے لئے جو الگ محاورہ بولتی ہیں بعض الفاظ کا قریش کے محاورہ پر ادا کرنا سخت مشکل ہے اس لئے خود اللہ تعالیٰ نے یہ اجازت دی ہے کہ وہ دوسرے حروف یعنی محاوروں میں بعض الفاظ کو پڑھ لیں غرض کہ حضرت عمرؓ کی ناراضگی کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس وقت تک اُن کو یہ علم نہیں تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دوسرے حروف پر قرآن شریف کو پڑھنے کی اجازت بھی دی ہے۔ اس لئے وہ کسی تھوڑے سے تغیر و تبدل کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔

حضرت عمرؓ اور ہشام کا اختلاف۔

ایک اور اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ اور ہشام دونوں ایک ہی قبیلہ کے تھے

پس اگر اختلافِ حروف محض اختلاف محاورہ ہی سے پیدا ہوتے تو حضرت عمرؓ اور ہشام کی قرات میں کچھ فرق نہیں ہونا چاہئے تھا۔ حالانکہ حدیث سے ثابت ہے کہ ان میں اختلاف ہوا۔ اس سے ہمارے بعض علما نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ اختلاف حروف سے مراد ایک ہی معنی کا مختلف الفاظ سے ادا کرنا تھا۔ اور بعض معترضین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اختلافِ حروف قرآن شریف کی عبارتوں کا اختلاف تھا۔ مگر محض عمرؓ اور ہشام کے ہم قبیلہ ہونے اور پھر اختلافِ قرات کے ہو جانے سے ایسے نتائج نکالنا بڑی بھاری غلطی ہے۔ اول تو اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ جب بذریعہ وحی سات حروف پر قرآن شریف کو پڑھنے کی اجازت ہو گئی تو یہ اجازت خاص خاص اقوام سے مخصوص نہ رہ سکتی تھی۔ قرآن کریم ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تمام صحابیوں کو نہ سکھاتے تھے بلکہ بعض صحابی بھی بعض کو سکھاتے تھے۔ اور اس طرح ایک قوم کی خصوصیات دوسری قوم میں جا سکتی تھیں۔ دویم یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اگر ایک قوم ایک لفظ کو ایک خاص طرز پر جو دوسری قوم میں مروج ہے ادا نہ کر سکے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ دوسری قوم بھی پہلی قوم کی طرز پر اس لفظ کو ادا نہیں کر سکتی۔ یہ بات مثال سے آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاوے گی۔ ہذیل اور ثقیف حتّٰی کی بجائے عتّٰی پڑھتے تھے۔ حتّٰی قریش کے محاورہ میں تھا اور اس کی بجائے ان کے محاورہ میں عتّٰی تھا مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ قریش عتی نہ بول سکتے تھے۔ اگرچہ عام طور پر وہ حتّٰی ہی بولتے تھے اور یہی اصل لفظ تھا۔ مگر وہ اگر چاہتے تو عتّٰی بھی پڑھ سکتے تھے۔ چنانچہ ایک حدیث سے ثابت ہے کہ ابن مسعود حتی حین کی بجائے بموجب محاورہ ہذیل و ثقیف عتّٰی حین پڑھتے تھے اور حضرت عمر نے اُن کو منع بھی کیا تھا کہ ہذیل کی لغت میں قرآن شریف لوگوں کو مت پڑھاؤ۔ اصل بات یہ تھی کہ قریش دوسری اقوام کے محاورات کے مطابق الفاظ کو ادا کرنے کے عادی ہو گئے تھے کیونکہ مکہ معظمہ میں جو اُن کا صدر مقام تھا مختلف قوموں کے لوگ ہر سال موسم حج میں اور میلوں وغیرہ پر جمع ہوا کرتے تھے اور قریش کو چونکہ ہر ایک قوم اور قبیلہ سے لین دین اور تجارت کا واسطہ پڑتا تھا۔ اور علاوہ ازیں علمی مناظرے اور مقابلے بھی باہمی ہوتے رہتے تھے اس لئے قریش کو ہر ایک قوم کے محاورہ سے واقفیت پیدا کرنی لازمی ہو گئی تھی۔ اب ہشام جب مسلمان ہوئے تو یہ وہ وقت تھا جب فتح مکہ کے بعد فوج در فوج عرب کی قومیں اسلام میں داخل ہو رہی تھیں۔ اور غالباً حضرت ہشام نے سورہ فرقان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے وقت سنا جب آپ کسی قوم کو پڑھا رہے تھے۔ اور اسی

طرح پر انہوں نے یاد کر لیا اور چونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اجازت تھی کہ فاقرؤا ما تیسر منہ یعنی جس طرح آسان ہو اسی طرح پڑھ لو۔ اس لئے حضرت ہشام نے قریش کے محاورہ کے مطابق اسے ادا کرنے کی کوشش نہ کی اور نہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس طرح پر پڑھنے سے منع فرمایا جس طرح وہ پڑھ رہے تھے۔ ان واقعات سے ناظرین آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں ہشام اور حضرت عمرؓ میں باوجودیکہ دونوں ایک ہی قبیلہ کے تھے اختلاف ہوا۔ حضرت عمرؓ اس زمانہ میں قرآن شریف کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھ چکے تھے جب ایک ہی حرف پر قرآن شریف پڑھا جاتا تھا اور ہشام نے ایسے وقت سیکھا جب دوسری قوموں کے اسلام میں کثرت کے ساتھ داخل ہونے سے اُن کو ان کے اپنے محاورہ کے مطابق ہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو قرآن شریف پڑھانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ پس یہی وجہ اختلاف کی تھی۔

سات حروف سے کیا مراد ہے۔

سات حروف میں پڑھنے سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ قرآن شریف کا ہر ایک لفظ سات طرز پر پڑھا جاتا تھا۔ بلکہ مطلب قرآن شریف کے سات حروف پر اتارا جانے کا صرف یہ ہی کہ جن محاورات میں پڑھے جانے کی اجازت تھی وہ سات تھے یا یوں کہو کہ ایک لفظ کی مختلف قرائتیں جو اختلاف محاورہ سے پیدا ہوتی تھیں وہ سات لغتوں میں سے ایک میں ہوتی تھیں۔ یہ اختلافات تعداد میں بھی کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتے۔ کیونکہ حدیث میں جس قدر اختلافات کا ذکر کیا گیا ہے وہ تعداد بہت تھوڑی ہے۔ اگر اختلاف بہت سے ہوتے تو احادیث میں ضرور اُن کا ذکر زیادہ ہوتا۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ بہت سی قرائتیں بعض مفسرین اس وقت بھی بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ قرائتیں اور سبعۃ احرف ایک چیز نہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ سبعۃ احرف والی قرائتیں بہت تھوڑی اس لئے ہم تک پہنچی ہیں۔ کہ حضرت عثمان نے اُن کا قرآن شریف میں لکھنا بند کر دیا تھا۔ تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ جو چیزیں احادیث میں محفوظ ہو کر آئی ہیں ان میں سے کوئی بھی لکھی ہوئی نہ تھی۔ اور ہزارہا واقعات بغیر معرض تحریر میں کبھی آنے کے احادیث میں پوری طرح سے محفوظ رہے۔ اختلاف کے کم ہونے کی وجہ ان قوموں کا باہمی میل جول تھا۔ جو اکثر میلوں مجلسوں۔ مشاعروں اور تجارت وغیرہ کے ذریعہ سے ہوتا رہتا تھا۔ اور انہی تعلقات کا یہ نتیجہ تھا کہ اُن کے اختلاف نہ بڑھنے پاتے تھے۔ سات لغات جن میں قرآن شریف کے بعض الفاظ کو ادا کرنے کی اجازت دی گئی تھی وہ تھیں جو عرب میں افصح ترین تھیں۔ مگر بعض کا

خیال یہ ہے کہ سات سے انحصار تعداد مقصود نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ علاوہ محاورہ قریش کے جس میں قرآن شریف کا نزول ہو رہا تھا کچھ اور محاورات بھی ایسے تھے جن میں بعض الفاظ قرآنی کو ادا کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ سات اور ستر وغیرہ اعداد عام طور پر کثرت کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

جس قدر بحث اوپر ہو چکی ہے اس سے ایک بے تعصب انسان کے دل کو تسکین دینے والی شہادت اس امر کی ملتی ہے کہ وہ اختلافات قرات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں سبعۃ احرف سے پیدا ہوئے تھے وہ قرآن کریم کا جزو نہ تھے نہ اس کی اصل عبارتوں میں داخل تھے۔ بلکہ جو ضرورت اُن کی اجازت کے لئے پیدا ہوئی تھی وہ ایک مقامی ضرورت تھی۔ اور تھی بھی عارضی۔ قریبًا کل کا کل قرآن شریف اس اجازت سے پہلے نازل ہو چکا تھا۔ جس قدر زیادہ غور ان قراتوں پر ہم کرتے ہیں اسی قدر زیادہ اطمینان اس نتیجہ کے متعلق حاصل ہوتا ہے کہ سات حروف میں پڑھنے کی اجازت محض بعض قوموں کی آسانی کے لئے تھی اور اس سے اصل قرآن کریم میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں آیا۔ بلکہ قرآن شریف وہی تھا اور ہمیشہ وہی رہا ہے جو ابتدا سے نازل ہوا تھا یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود جب نماز جماعت میں قرآن شریف پڑھتے تھے تو آپ بھی ان حروف میں نہ پڑھتے تھے جن میں بعض دوسرے لوگ پڑھ لیتے تھے۔ بلکہ آپ ہمیشہ قرآن شریف کو اسی طرح نمازوں میں پڑھتے رہے جس طرح یہ اصل میں نازل ہو چکا تھا۔ اس نتیجہ کو ان واقعات سے بھی تائید ملتی ہے کہ حضرت ابی اور ابن مسعود اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم جیسے صحابیوں نے جب کسی دوسرے حرف پر قرآن شریف کسی کو پڑھتے سنا تو وہ بہت متعجب ہوئے اور گھبرائے کیونکہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ان دوسرے حروف میں سے کسی پر قرآن شریف پڑھتے تو ان جلیل القدر صحابہؓ کو جو اکثر پانچوں نمازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھتے تھے خود اطلاع مل جاتی اور پھر دوسرے لوگوں کو پڑھتے سن کر انہیں تعجب نہ آتا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے کہ نمازوں میں آپ قرآن شریف کو اسی طرح پڑھتے رہے جس طرح وہ کلام پاک ابتدا میں نازل ہو چکا تھا یہ ثبوت ملتا ہے کہ دوسرے حروف کی غرض محض ایک خاص غرض تھی اور اس سے اصل عبارت قرآنی میں نہ کوئی کمی بیشی ہوئی اور نہ کوئی تغیر و تبدل ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ایک اور شہادت بھی اسی

آنحضرت نمازوں میں قرآن شریف کو نزول اول کے مطابق ہی پڑھتے رہے اور ایک ہی حرف پر لکھواتے رہے

کی موید ہمیں ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ قرآن شریف کو جب لکھواتے تھے تو تب بھی اسی نزول کے مطابق لکھاتے تھے۔ جو قرآن کریم کا پہلا اور اصلی نزول تھا اور جو حصص قرآن کریم کے سبعہ احرف کی اجازت کے بعد بھی نازل ہوئے تو وہ بھی اپ نے لسان قریش کے مطابق ہی لکھائے کیونکہ اصل نزول قرآن شریف کا اسی زبان میں تھا یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے جب حضرت زید رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کریم کے کام پر مامور کیا تو ان کو یہ ارشاد فرمایا کہ اصلی تحریریں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی ہیں انہیں اکٹھا کریں۔ کیونکہ وہ مطمئن تھے کہ ان تحریروں میں قرآن شریف کسی دوسرے حرف کے مطابق نہیں لکھا گیا بلکہ جس طرح پر قرآن کریم کو محفوظ رکھنے کا منشاء وحی الٰہی کا تھا اسی طرح پر لکھا گیا ہے۔ اور دوسرے حروف کو آپ نے تحریروں میں کوئی دخل نہیں دیا۔ قراء سے تو ایسا ممکن تھا کہ باوجود قریش ہونے کے ان میں سے کسی نے کوئی دوسرا حرف کسی موقع پر اختیار کر لیا ہو۔ جیسا کہ ابن مسعود کے حال سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر تحریر میں یہ بات ممکن نہ تھی۔ پس ایک طرف تحریر میں قرآن شریف کو اسی طرح محفوظ رکھنا جو اس کا پہلا نزول تھا اور دوسری طرف خود نمازوں میں اسی قرات کو پڑھنا جو پہلے نزول کے مطابق تھی یعنی لسان قریش میں یہ دو اور نہایت زبردست شہادتیں اس بات پر ہیں کہ مختلف حروف کی اجازت دینے سے آپ کا یہ منشا کبھی نہ تھا اور نہ ہی وحی الٰہی کا یہ منشا تھا کہ وہ دوسری قرائتیں بھی ہمیشہ کے لئے جزو قرآن سمجھی جاویں۔ بلکہ وہ ایک خاص ضرورت تھی اور اصل الفاظ قرآنی وہی تھے۔ جن میں شروع سے یہ پاک کلام نازل ہو رہا تھا۔

قرآن مجید باوجود اختلاف حروف کے ایک ہی تھا اور ایک ہی رہا

اس قدر بحث کے بعد اب ہم اعتراض اول پر غور کرتے ہیں جس کا ذکر شروع مضمون میں کیا گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مختلف حروف یا قراتوں کی اجازت دی ان کی حقیقت ہم کھول کر بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ بھی دکھا چکے ہیں کہ یہ صرف ایک وقتی ضرورت کے لئے تھی اور آنحضرت صلعم نے کبھی یہ حکم نہیں دیا کہ اُن کو تحریر میں لایا جاوے۔ نہ ہی کبھی خود جماعت کراتے وقت اِن قراتوں کو اختیار کیا۔ حالانکہ آپ پر وہ نازل ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں باوجودیکہ قرآن کو سات حروف میں پڑھنے کی اجازت وحی الٰہی سے تھی اور ان سب قراتوں کو نازل شدہ ہی بیان کیا گیا ہے۔ مگر پھر بھی قرآن شریف کے متعلق عام طور پر یہی کہا جاتا تھا کہ قرآن کریم لسانِ قریش میں نازل ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر نے ابن مسعود کو لکھا تھا کہ قرآن شریف کو لغت

ہذیل میں مت پڑھاؤ کیونکہ نزول قرآن شریف کا لسان قریش میں ہے۔ حضرت عمرؓ خوب اس بات سے اطلاع رکھتے تھے کہ سات حروف پر قرآن شریف کا نزول تو ہے کیونکہ خود انہی کو حضرت ہشام کے ساتھ اختلاف کا واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ پھر باوجود اس کے یہ لکھنا کہ قرآن شریف لسان قریش میں نازل ہوا ہے اس کو لغت ہذیل میں مت پڑھاؤ کیا معنی رکھتا ہے؟ ہر ایک عقلمند سوچ سکتا ہے کہ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسے ایسے جلیل القدر صحابہؓ خوب جانتے تھے کہ دیگر حروف میں نزول سے کیا مراد ہے اور کہ وہ ایک خاص وقت اور خاص ضرورت کے لحاظ سے ہے اور اس سے اصل نزول قرآنی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ اسی طرح پر جب حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کے نسخے بغرض اشاعت بہ بلاد متفرق لکھوانے شروع کئے تو آپ نے بھی کاتبوں کو یہی ہدایت دی کہ جب کسی لفظ کی طرز تحریر میں اختلاف ہو (کیونکہ کتابت پر کئی شخص مامور تھے) تو اسے لسان قریش میں لکھا جائے۔ کیونکہ قرآن شریف لسان قریش میں نازل ہوا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ حضرت زید مدینہ کے رہنے والے تھے۔ اور اُن کی طرز تحریر ممکن تھا کہیں قریش سے اختلاف رکھتی ہو جیسا کہ ان نسخوں کے لکھتے وقت بھی تابوت کی طرز تحریر پر اختلاف ہوا۔ اور آخر اسی طرز پر یہ لفظ لکھا گیا جیسا کہ قریش لکھتے تھے اور فیصلہ کرتے وقت پھر حضرت عثمان نے یہی فرمایا کہ قرآن شریف لسان قریش میں نازل ہوا ہے اور تمام صحابی اس میں اُن کے ساتھ متفق تھے۔ کیا یہ گمان ہو سکتا ہے کہ ان تمام صحابہؓ کو یہ پتہ نہ تھا کہ قرآن شریف کا نزول بعض دیگر حروف پر بھی ہوا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اصل بات یہ تھی کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو جانتے تھے کہ دیگر حروف میں قرآن شریف کے کسی لفظ کے پڑھے جانے سے کیا مطلب ہے اور اس کی کیا ضرورت ہے اور اسی لئے آپ نے نہ عام نمازوں میں کسی دوسرے حرف کی قرات کو اختیار کیا نہ تحریر میں اس کو آنے دیا۔ اسی طرح پر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین بھی ان اختلافات حروف کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ قرآن شریف جس طرح دیگر حروف کی اجازت سے پہلے ایک ہی تھا اسی طرح اس اجازت کے بعد بھی ایک ہی رہا اور اس میں کوئی فرق کوئی تغیر تبدل نہیں ہوا۔ ایک لمحہ کے لئے بھی کسی صحابی نے خیال نہیں کیا کہ دیگر حروف میں قرآن شریف کے نزول سے نزول اول میں جو لسان قریش میں تھا کچھ ایزادی ہو گئی ہے۔ یا کچھ تغیر و تبدل ہو گیا ہے۔ بس وہی قرآن شریف آج ہمارے ہاتھوں میں ہے جو دیگر حروف کی اجازت سے پہلے تمام صحابہؓ پڑھتے اور لکھتے تھے اور جو دیگر حروف کی اجازت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازوں میں پڑھا اور لکھوایا۔ اسی قرآن شریف کو

حضرت ابوبکرؓ نے جمع کرایا اور کوئی قرات دوسرے حروف کی اس میں اس وقت بھی درج نہیں کی گئی نہ ہی کسی صحابی نے اس وقت یہ اعتراض کیا پھر اسی سے حضرت عثمان نے نقلیں کرائیں اور اگر یہ کہا جائے کہ اگر حضرت ابوبکر والے صحف میں دوسرے حرف کی کوئی قرات نہ تھی تو حضرت عثمان نے یہ حکم کیوں دیا کہ جب جماعت قریش اور زید بن ثابت کسی بات میں اختلاف کریں تو اسے لسان قریش میں لکھیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں طرز تحریر کا ذکر ہے نہ قرات کا چونکہ اول لکھنے والے زید رضی اللہ عنہ تھے اور وہ مدنی تھے قریش نہ تھے اس لئے اب جو قرآن شریف لکھا گیا جسکی اشاعت تمام بلاد میں ہونی تھی تو اس میں یہ احتیاط بھی کر لی گئی کہ طرز تحریر قرآن کریم کا بھی بالکل قریشی طرز پر ہو چنانچہ ایک ہی اختلاف جو اس وقت زید بن ثابت اور قریشیوں میں ہوا وہ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے لفظ تابوت کی طرز تحریر کے متعلق تھا۔ لفظ تابوت اس سورت میں واقع ہوتا ہے جو مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ اور یہ وہ وقت تھا جب حضرت زید کاتب الوحی کا کام کرتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسے اپنی طرز پر لکھ لیا۔ مکی سورتوں میں کسی ایسے اختلاف طرز تحریر کا ذکر نہیں کیونکہ وہاں لکھنے والے سب وہی لوگ تھے جو قریش میں سے تھے اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید نے تمام اصلی تحریریں اکٹھی کی تھیں۔ اس قدر اور بھی دوبارہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ یہ اختلاف جو لفظ تابوت کی طرز تحریر کے متعلق پیدا ہوا صرف اس قدر تھا کہ یہ لفظ لمبی ت کے ساتھ لکھا جاوے یا گول ۃ کے ساتھ اس سے قرات کا اختلاف ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

حضرت عثمان کی کارروائی مطابق منشائے نبی کریم اور حفاظت قرآن کیلئے تھی

اب ہم قطعی اور یقینی شہادت کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان ٹکڑوں کو جلانے کا حکم دینے سے جو بے احتیاطی سے کسی صحابی نے کسی دوسرے حرف پر لکھ لئے ہوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوئی حصہ قرآن شریف کا نہیں جلایا۔ یا ضایع کیا۔ اگر انہوں نے اختلاف حروف کو قطعی طور پر نیست و نابود بھی کر دیا تو بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے قرآن شریف کے ایک حصہ کو ضایع کر دیا۔ کیونکہ یہ حروف قرآن شریف کا جزو کبھی نہیں تھے اور اس لئے کسی ایسے لفظ کے مروج نہ رہنے سے جو قرآن شریف کا جزو کبھی نہ تھا یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن شریف کا ایک حصہ گم ہو گیا یا تاویل القرآن کے مجنون معترض کی طرح یہ بڑھانا کہ قرآن شریف کا ایک بہت بڑا حصہ ساقط ہو گیا۔ اور جو کچھ رہ گیا وہ اس کی یادگار ہے پرلے درجہ کی نادانی اور حماقت ہے۔ حضرت عثمانؓ نے کونسی نئی کارروائی کی؟ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ خود آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے بھی کیا تھا۔ اگر دیگر حروف کی قرائیں قرآن شریف کا جزو تھیں تو آنحضرت نے خود یہ حکم کیوں نہ دیا کہ جس طرح کاتب اصل نزول قرآن کریم کو لکھتے ہیں اسی طرح دیگر حروف کی قراتوں کو لکھیں؟ کیوں نمازوں میں جماعت کراتے وقت کبھی کسی حرف کی قرات اور کبھی کسی کی قرأت نہ پڑھی؟ پھر حضرت ابو بکرؓ نے جب تحریری جمع قرآن کا حکم دیا تو کیوں انہوں نے یا کسی صحابی نے یہ تجویز پیش نہ کی کہ ساتوں حروف پر الگ الگ قرآن شریف جمع ہونے چاہئیں یا ساتوں حروف کی قرائیں ایک ہی مجموعہ میں داخل کی جاویں کیوں اصل تحریریں جمع کرنے کا حکم دیا گیا جس سے یہ غرض تھی کہ مجموعۂ صحف میں کوئی دیگر حروف کی قرات داخل نہ ہو جائے۔ پھر حضرت عمرؓ کو دیکھا جاتا ہے تو وہ بھی ابن مسعود کو لکھتے ہیں کہ ہذیل کی لغت پر قرآن شریف لوگوں کو مت پڑھایئے کیونکہ قرآن شریف لسان قریش میں نازل ہوا ہے پس انہی کے نقش قدم پر حضرت عثمانؓ چلے اور انہوں نے بھی حروف مختلفہ کی قرات کو قرآن شریف میں داخل نہ ہونے دیا۔ ہاں ساتھ یہ بھی اہتمام کیا کہ جو ایسے نسخے لوگوں نے خود لکھ لئے تھے جن میں بعض دیگر حروف کی قرائیں لکھی تھیں یا کوئی اور غلطی ہو گئی تھی۔ کیونکہ کافی احتیاط نہ کی تھی ان تمام نسخوں کو جلا دیا جاوے اور اس طرح کرنے میں بھی انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے منشا کو پورا کیا۔ جو واقعات اس وقت پیش آئے اور جن کی وجہ سے حضرت عثمانؓ نے یہ کارروائی کی وہ تفصیلاً دوسری جگہ بیان ہو چکے ہیں۔ اسلام اس زمانہ میں عرب سے باہر دور دراز ملکوں میں پھیل چکا تھا۔ اور بلاد متفرقہ کے لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور ہو رہے تھے۔ ان لوگوں کو قرآن کریم سکھانا عرب کی اقوام کو ابتدائے اسلام میں قرآن کریم سکھانے سے ایک الگ رنگ رکھتا تھا۔ عرب کے لوگوں کی تو بولی ہی عربی تھی اور اُن کے لئے قرآن کریم سیکھنا ایک آسان امر تھا مگر اس آسانی کے ساتھ ابتدا میں ایک مشکل بھی ملی ہوئی تھی اور وہ یہ کہ بعض ان اقوام کے لہجے الگ تھے اور وہ لوگ بچپن سے بعض الفاظ کو خاص طرح پر پڑھنے کے عادی ہو گئے تھے اور یکایک اپنے لہجہ اور طرز ادا میں تبدیلی کرنا اُنکے لئے سخت مشکل تھا مگر جو عجمی لوگ اسلام میں داخل ہوتے تھے اُن کے لئے نہ تو عربوں والی آسانی تھی اور نہ ہی ان جیسی مشکل تھی۔ اُن کے لئے قرآن کریم کے پڑھنے کے لئے عربی زبان کا سیکھنا بھی ضروری تھا مگر اس طرح پر سیکھنے میں اُن کے لئے یہ برابر تھا کہ لسان قریش پر پڑھنا سیکھیں یا کسی دوسرے حرف پر اب بعض صحابی جو بعض الفاظ کو کسی دوسرے حرف پر ادا کر لیتے تھے انہی دوسرے حروف پر ان

عجمیوں کو بھی قرآن شریف سکھانے لگے۔ اور چونکہ عجمی لوگ اس بات سے ناواقف تھے کہ ان اختلافات کی اصل وجہ کیا ہے اور کس ضرورت کے لئے یہ اجازت دی گئی تھی اُن کے درمیان ان قراتوں پر اختلاف ہونے لگے یہاں تک کہ یہ اختلاف بہت بڑھے اور بعض بعض کی تکفیر اسی وجہ پر کرنے لگے۔ یہ وہ حالت تھی جسے دیکھ کر حذیفہ رضی اللہ عنہ گھبرائے اور حضرت عثمان کے پاس آکر ذکر کیا کہ اختلاف کی کیا حالت ہوگئی ہے اور اس سے کیا کیا بدنتائج پیدا ہونے شروع ہوئے ہیں حضرت عثمان رضؓ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا اور یہی صلاح قرار پائی کہ جو نسخے ایسے خود لوگوں نے لکھ لئے ہیں جن میں کہیں دوسرے حرف کی قرات بھی داخل ہوگئی ہے اُن کی اشاعت بند کردی جاوے تاکہ ان اختلافات کا سرے سے ہی قلع قمع ہوجاوے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود بھی یہ منشا کبھی نہ تھا کہ دوسرے حروف کی قراتیں ہمیشہ مروج رہیں وہ ایک خاص ضرورت تھی جو اس وقت رفع بھی ہو چکی تھی کیونکہ اُن قوموں کے اسلام پر قریب چودہ پندرہ سال گذر چکے تھے اور وہ بھی اس قابل تھے کہ لسانِ قریش کے مطابق جس میں قرآن کریم کا اصل نزول تھا کلام الٰہی کو پڑھ سکیں اور نئی نسل تو شروع سے جس طرح عادی کی جاوے ہوسکتی تھی۔ سو واقعات پیش آمدہ پر غور کرکے حضرت عثمان رضؓ نے یہ حکم دیا۔ کہ قرآن شریف کے نسخے بڑی احتیاط کے ساتھ اجلہ صحابہ رضؓ کی نگرانی میں لکھوائے جائیں اور سوائے صحف ابی بکر رضؓ کے جس سے نقلیں کرائی گئی تھیں باقی تمام نسخے جلادیئے جائیں۔ پس دوسرے نسخوں کے جلانے سے اصل غرض حضرت عثمانؓ کی قرآن کریم کی حفاظت تھی تاکہ وہ غلطیاں جن کا بے احتیاطی سے لکھے ہوئے نسخوں میں راہ پاجانا ممکن تھا اور ایسا ہی بعض دوسری قراتیں جو کسی صحابی نے غلطی سے قرآن کریم کے اندر داخل کردی ہوں قرآن کریم میں مل نہ جائیں۔ پس حضرت عثمان کا فعل حفاظت قرآن کریم کا ممد تھا۔ جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر حروف کی قراتوں کو قرآن کریم کے اندر داخل کرنے اور لکھنے کا حکم دیا تھا اس وقت تک حضرت عثمان رضؓ کے فعل پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔

ایک ہی قرآن پر سب کا اتفاق

اب ہم دوسرے اعتراض کو لیتے ہیں۔ اس اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض قراتیں جو مفسرین اپنی تفسیروں میں لکھتے ہیں اُن کی موجودگی میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اصل الفاظ قرآن کریم کے کون سے ہیں اور دوسری قراتیں کونسی۔ قبل اس کے کہ ان قراتوں کی اصلیت پر بحث کی جاوے ایک فیصلہ کن امر ایسا موجود ہے کہ جس سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ قرآن شریف جو بین الدفتین موجود ہے وہی کتاب پاک ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے درمیان چھوڑی۔ اور وہ

یہ ہے کہ اتنی وسیع اسلامی دنیا میں اس قدر عرصہ کے درمیان ہر ایک قسم کے اختلاف کے باوجود یہی ایک ہی قرآن کریم موجود رہا ہے اور موجود ہے اور کوئی نسخہ قرآن شریف کا ایسا نہیں دکھایا جا سکتا جو اس کے ساتھ کسی حرکت یا حرف یا لفظ کا اختلاف رکھتا ہو اور نہ ہی مزعومہ قراتوں میں سے کوئی قرات بجائے اصل الفاظ کے کبھی قرآن شریف میں لکھی گئی ہے ایک بھی نسخہ قرآن شریف کا ایسا دکھایا نہیں جا سکتا جس میں اس قرآن کریم کے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے کسی لفظ کو چھوڑ کر کوئی دوسری قرات اس کی بجائے لکھ دی گئی ہو۔ کیا یہ اس بات کی کافی شہادت نہیں ہے کہ قرآن شریف محفوظ اور بلا تغیر و تبدل چلا آیا ہے؟ غور کرو کہ تیرہ سو سال کا عرصہ ایک کتاب پر گذر تا ہے اور اس کے بعض نسخے تو مشرق میں پائے جاتے ہیں اور بعض مغرب میں ایسے ایسے ممالک میں جن میں باہمی کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر ایسی ایسی مسلمان اقوام کے اندر اس کے نسخے پائے جاتے ہیں جن کو بچھڑے ہوئے ایک عرصہ بعید گذر گیا ہے۔ پھر اُن کے درمیان کسی قسم کے تعلقات نہیں رہے اور پھر ایسے ایسے مسلمان فرقوں کے ہاتھوں میں اس کے نسخے موجود ہیں جو ایک دوسرے کی جان کے دشمن رہے ہیں اور ہیں مگر باوجود اختلاف زمانہ۔ اختلاف ممالک۔ اختلاف زبان اور اختلاف فرقہ کے قرآن شریف ایک ہی رہا ہے۔ خارجی شیعہ کی جان کا دشمن۔ شیعہ خارجی کی جان کا دشمن۔ باتیں تو ایک شخص کا اختیار ہے جتنی چاہے بنالے مگر کیا کوئی بھی نسخہ قرآن کا کسی کے ہاتھ میں ایسا ہے جو اس قرآن کریم سے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے اختلاف رکھتا ہو؟ اب غور کرو کہ اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے دوسری قراتوں کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ کوئی بڑا آدمی قرآن شریف کے بعض الفاظ کو دوسری طرح بھی پڑھ لیا کرتا تھا۔ ان روایتوں کو صحیح تسلیم کر کے بھی یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ قراتیں واقع میں کلام الٰہی تھیں یا قرآن شریف کا جزو تھیں۔ نہیں بلکہ اس سے اس قدر نتیجہ بھی نہیں نکلتا کہ جو لوگ ان قراتوں کو پڑھتے تھے وہ درحقیقت انہیں قرآن کریم کا جزو سمجھتے تھے۔ یا یہ کہ جس لفظ کی بجائے وہ کوئی دوسری قرات اختیار کرتے تھے۔ اس لفظ کو کلام الٰہی کا جزو نہ مانتے تھے اور اس کی بجائے اپنی قرات کو قرآن شریف کے اصل لفظ مانتے تھے۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ اگر درحقیقت وہ اپنی قراتوں کو ایسا سمجھتے تو پھر کون شخص مانع تھا کہ وہ اپنے نسخہ جات قرآن میں انہی قراتوں کو لکھ بھی لیتے اور جو الفاظ اصل نسخوں میں موجود تھے اُن کو نکال ڈالتے اور اس طرح پر سینکڑوں متفرق نسخے قرآن شریف کے تیار ہو جاتے جن کی اشاعت ہو کر آج اگر ایک اسلامی شہر میں ایک نسخہ ملتا تو دوسرے میں کوئی اور ہی نسخہ ملتا۔ مگر چونکہ ایسے نسخوں کا وجود دنیا میں نہیں پایا جاتا معلوم ہوا کہ ایسا اختلافی نسخہ کبھی کوئی موجود ہی

نہ تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کو اسلامی حکومت کا ڈر تھا۔ اس لئے وہ ان قراتوں کو نہ لکھ سکتے تھے اور نہ کسی لفظ میں تغیر و تبدل کر سکتے تھے تو یہ جھوٹ ثابت ہوتا ہے کیونکہ جب وہ کھلے طور سے دوسری قراتوں کو پڑھ لیتے تھے اور اس وقت حکومت کا ڈر نہ تھا تو لکھتے وقت کہاں سے ڈر آگیا۔ بلکہ پڑھنے سے تو زیادہ تشہیر ہوتی تھی۔ اور نسخہ میں لکھا ہونے سے سوائے چند رازداروں کے اور کسی کو اطلاع نہ ہوسکتی تھی۔ پس یا تو یہ بھی جھوٹ ہے کہ وہ دوسری قراتوں کو پڑھتے تھے اور اعتراض دور ہوگیا۔ یا اگر یہ صحیح ہے کہ وہ پڑھ لیتے تھے تو معلوم ہوا کہ ان قراتوں کو اس قدر وقعت نہ دیتے تھے کہ انہیں جزو قرآن کریم خیال کرتے ہوں۔ اور اسی وجہ سے ان کو تحریر کے اندر نہ لاتے تھے اور نہ قرآن کریم کے نسخوں میں جو ان کے پاس تھے کوئی تغیر و تبدل کرتے تھے۔ بہرحال معلوم ہوا کہ قرات کے اختلاف سے خواہ اس کی کچھ ہی حقیقت ہو یہ مراد لینا کہ قرآن شریف کی اصل عبارتیں محفوظ نہیں رہیں اور بعض لوگ ایک لفظ کو قرآن کریم کا جزو سمجھتے ہیں تو بعض دوسرے کو۔ بالکل غلط خیال ہے۔ بلکہ ایسا خیال کرنا سراسر نادانی ہے۔

دوسری قراتوں سے مراد

اب قراتوں کی اصل حقیقت پر ہم غور کرتے ہیں۔ اس بات کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہئیے کہ جن قراتوں کا ذکر بعض روایتوں اور تفاسیر میں پایا جاتا ہے وہ اور سبعہ احرف والی قراتیں ایک نہیں اگرچہ ان میں کوئی سبعہ احرف والی قرات موجود ہو۔ مگر دونوں کو بعینہ ایک سمجھنا اور سبعہ احرف سے مشہور سات قراتیں مراد لینا سخت غلطی ہے اور اس غلطی کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک تو حرف کا لفظ قرات کی جگہ مستعمل ہونے لگا۔ اور دوسرے قراتوں کی تعداد بھی سات ہی مشہور ہوگئی۔ اور یہی تعداد احرف کی تھی جس کا ذکر حدیث میں تھا اس لئے بعض لوگوں نے کم فہمی سے سبعہ احرف اور سات قراتوں کو ایک سمجھ لیا۔ موجودہ قراتوں کو جہاں تک میں سمجھتا ہوں مفصلہ ذیل عنوانوں کے نیچے رکھا جا سکتا ہے۔ اوّل وہ قراتیں جو سبعہ احرف سے پیدا ہوئیں حضرت عثمان نے جو منع فرمایا وہ صرف یہ تھا کہ دیگر حروف کی قراتوں کو قرآن شریف میں لکھا نہ جائے لیکن بعد میں اگر کسی شخص نے اُن کو پڑھ لیا ہو تو ایسا ممکن تھا اور خصوصاً احادیث میں اُن کا تذکرہ رہ گیا۔ لیکن موجودہ قراتوں میں سے سبعہ احرف والی قراتوں کو الگ کرنا مشکل کام ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔ بعض لوگوں نے یہ قاعدہ تجویز کیا ہے کہ جو قراتیں اپنی طرز تحریر میں قرآن شریف سے نہیں ملتیں وہ سبعہ احرف والی قراتیں ہیں مگر یہ محض اٹکل ہے اور اس کی شہادت یا ثبوت ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ اور جیسا کہ دکھایا جا چکا ہے ان قراتوں کی اجازت ایک وقتی ضرورت کے لئے تھی اور اُن کا پڑھنا یا جاننا کسی

مسلمان کے لئے ضروری نہ تھا۔ اور نہ اب ضروری ہے۔ پس ہمیں اس تحقیقات کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دوم بعض اس قسم کے اختلاف جیسے واؤں کی گنتی میں جو نہایت خفیف اختلافات ہیں۔ سوم ایسا ہو سکتا ہے کہ اختلاف محاورہ کی ضرورت کے علاوہ بعض جگہ وحی الٰہی سے کسی دوسری قرات کی اجازت بھی دے دی گئی ہو۔ اصل عبارت تو اسی وقت لکھی گئی اور محفوظ رہی اور آج تک اسی طرح مصاحف میں لکھی جاتی ہے اور ایسی قرات ایک وقت کیلئے کسی نے پڑھ لی یا پڑھا دی۔ کیونکہ یہ بھی محض اجازت تھی اور اس کا قرآن شریف میں پڑھنا لازمی نہ تھا بلکہ رخصت کے طور پر تھا۔ مگر ایسی قرات کی صحت اس وقت تک تسلیم نہیں کی جا سکتی جب تک اعلیٰ درجہ کی معتبر اور صحیح احادیث سے ثبوت نہ ملے اور اگر ایسا ثبوت مل جائے تو اس سے بعض وقت بعض الفاظ کے معنوں پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ یعنی دوسری قرات کو ایک لفظ کے معنے کے لئے بطور ایک تشریح کے سمجھا جا سکتا ہے۔ چہارم۔ بعض قراتیں اس طرح پیدا ہو گئیں کہ ایک لفظ کی تشریح یا تفسیر کو قرات سمجھ لیا گیا۔ مثلاً ایک صحابی نے قرآن شریف پڑھتے وقت ایک لفظ کی کسی دوسرے لفظ سے تشریح کر دی یا اپنے نسخہ قرآن میں کسی لفظ کے معنی کو حاشیہ پر لکھ دیا۔ تو سننے والوں یا دیکھنے والوں نے اسے بھی ایک قرات سمجھ لیا۔ ایسی غلطیوں کے ازالہ کے لئے حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے جو کوششیں کیں وہ کافی سے زیادہ تھیں۔ اور کوئی ایسی غلط فہمی قرآن میں راہ نہیں پا سکی۔

سب سے آخر اب ہم اُن قراتوں کا ذکر کرتے ہیں جو تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ ان قراتوں کے پیدا ہونے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے مصاحف لکھا کر مختلف دیار و امصار میں بھجوائے تو ایسے مصاحف نقطوں اور اعرابوں سے خالی تھے۔ اس لئے مختلف مقامات میں بعض الفاظ مختلف طور سے پڑھے جانے لگے۔ اگر اس اختلافِ قرات کے یہ معنی لئے جاویں کہ ہر ایک شخص ایک خاص طرز پر پڑھتا تھا اور اسی کو صحیح اور اصل قرات قرآن شریف کی سمجھتا تھا اور اپنے شاگردوں کو اسی طرح پڑھاتا تھا اور ایک دوسرا شخص اس کے برخلاف پڑھتا اور پڑھاتا تھا تو یہ دعویٰ دو طرح سے باطل ثابت ہوتا ہے۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر قرآن شریف واقع میں مختلف بلاد میں مختلف قاری مختلف طرز پر پڑھتے اور پڑھاتے تھے اور ہر جگہ وہی قرات صحیح سمجھی جاتی تھی اور دوسروں کی قرات کو غلط سمجھا جاتا تھا تو پھر کیا وجہ ہوئی کہ ایسی قرات نے قرآن شریف کی اصلی قرات کو جیسا کہ وہ ہمارے ہاتھوں میں ہے بدل نہ دیا۔ اور اصل کی

بجائے وہی قرات مروج نہ ہوگئی؟ یعنی کیوں ایسی قراتیں قرآن شریف کے نسخوں میں لکھ نہ لی گئیں! قراتوں کے پیدا ہونے کا وقت تو وہ بتایا جاتا ہے جب زبر زیر اور نقطے قرآن شریف کے الفاظ پر موجود تھے۔ کیونکہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں ان قراتوں کا نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ بلکہ یہ قراء کی جماعت بعد میں پیدا ہوئی۔ اب یہ عجیب بات ہے کہ جو نسخے قرآن شریف کے لکھے ہوئے ایسے مقامات پر موجود تھے وہ کچھ اور تھے۔ اور یہ پڑھانے والے یا قاری کسی اور طرح پڑھاتے تھے ایک سمجھدار انسان ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کو مان نہیں سکتا کہ ایک مقام پر عام رواج تو کسی اور قرات کا ہو اور قرآن شریف میں جو وہاں عام طور پر شایع ہو رہا ہو کوئی اور قرات موجود ہو۔ یعنی قرآن شریف میں لکھا ہوا کچھ ہو اور پڑھایا کچھ جاتا ہو۔ مثلاً سوال یہ ہے کہ جب یہ لوگ بچوں کو قرآن شریف پڑھانا شروع کرتے تھے تو کون سے نسخے اُن کے سامنے کھول کر رکھتے تھے تاریخ بلند آواز سے شہادت دے رہی ہے کہ قرآن شریف کا کوئی نسخہ کسی اور قرات والا کسی وقت مسلمانوں میں کسی مقام پر بھی رائج نہیں ہوا پس اگر پڑھانے کیلئے وہی قرآن شریف تھا جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے اور اسی کے مطابق پڑھایا جاتا تھا تو دوسری قراتوں کی وقعت کیا رہی اور وہ کیا کام دیتی تھیں؟ اگر یہ کہو کہ پڑھاتے وقت کوئی اور قرات اختیار کی جاتی تھی تو کوئی عقلمند انسان اس بات کا باور نہیں کر سکتا کہ بچے کے سامنے لکھی ہوئی عبارت تو کچھ اور ہو اور اس کو پڑھایا کچھ اور جاتا ہو اور اگر یہ کہا جائے کہ انہیں دوسری قراتوں کے مطابق ہی قرآن شریف لکھا بھی جاتا تھا تو ہم کہتے ہیں کہ اس کا ثبوت تاریخ سے دو کہ کبھی اختلاف والے نسخے قرآن شریف کے مروج تھے اور ان نسخوں کو دکھانا بھی چاہئیے آخر وہ کیا ہوئے سینکڑوں برسوں کے پرانے نسخے جس قدر ملتے ہیں وہ تو وہی ہیں جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ اگر ایسے کوئی نسخے ہر مقام پر الگ الگ لکھے ہوئے موجود تھے تو بتاؤ کہ اُن کو کس نے جلایا اور کس طرح ساری اسلامی دنیا میں سے کیا شرق میں اور کیا غرب میں اور سارے اسلامی فرقوں میں سے وہ یکایک نابود ہو گئے؟ پس ثابت ہوا کہ دوسری قراتوں کو کبھی کسی نے پڑھا بھی تو اس نے خود بھی ان کو اس قدر وقعت نہیں دی کہ وہی قرائیں دوسروں کو بھی پڑھاتا اور اُن کو رواج دیتا۔ یا اس قابل سمجھتا کہ وہ لکھی جا کر آیندہ نسلوں تک پہنچ سکیں۔

دوسری دلیل جو اس خیال کو باطل ٹھیراتی ہے یہ ہے کہ اگر مختلف مقامات میں مختلف قراتیں پڑھی اور پڑھائی جاتیں تو کم از کم اتنا تو ہوتا کہ پڑھنے میں ہی یہ قرائیں ایسا رواج پا جاتیں کہ ایسے مقام پر نسلاً بعد نسل یہی قرائیں اختیار کر لی جاتیں۔ کیونکہ جیسا کہ کہا جاتا ہے ان قراتوں کو یا اُن میں سے

بعض کو اختیار کرنیوالے بڑے بڑے آدمی تھے پس دو حال سے خالی نہیں یا تو اُن لوگوں نے جو قراتیں مشہور کیں اُن میں سے کسی کو مسلمانوں نے عام طور پر اختیار نہیں کیا۔ اس صورت میں یہ قراتیں کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ کیونکہ نہ صرف وہ تحریر کے مخالف ہی پائی گئیں بلکہ جمہور نے بھی اُن کو قبول نہیں کیا۔ اور یا جمہور نے اُن کو صحیح تسلیم کر کے اختیار کر لیا مگر یہ اس وجہ سے باطل ٹھیرتا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو اب بھی ضرور وہی اختلاف قرات میں باقی رہے ہوتے مگر یہ صورت نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح ایک ہی قرآن شریف تحریر میں موجود ہے اسی طرح ایک ہی قرآن شریف حافظوں میں موجود ہے اور اگر تجربتاً ایک قرآن مجید پڑھنے والا اسلامی دنیا کے ایک سرے سے اور ایک دوسرے سرے سے لیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ دونوں ایک ہی طرح پڑھتے ہیں اور اُن کی قراتوں میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے اس سے ہم یقینی طور پر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ پہلے بھی کبھی کسی زمانہ میں قرآن شریف کے پڑھنے میں قراتوں کا اس طرح اختلاف نہیں ہوا۔ جس طرح کہا جاتا ہے کیونکہ اگر کوئی اختلاف ہوتا تو چاہئے تھا کہ اس کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا چلا جاتا نہ ہی تاریخ سے یہ پتہ لگتا ہے کہ ایک زمانہ تک ایسے اختلاف رہے اور پھر یکا یک وہ سب کے سب خود ہی رفع ہو گئے اسلام ایک خاص دائرہ کے اندر محدود نہیں رہا۔ بلکہ ابتدا سے دور دور ملکوں میں پھیل گیا تھا اور کوئی انسانی طاقت ایسی نہ تھی جو کافہ مسلمین کو باوجود اختلاف کے پہلے موجود ہونے کے ایک ہی قرات پر جمع کر دیتی ہاں ایک طاقت تھی اور وہ وہی تھی جس نے پہلے ہی یہ فرمایا تھا انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحفظون پس جس طاقت سے پہلے یہ لفظ بولے گئے تھے اسی طاقت نے وہ کام بھی کر دکھایا جو انسانی طاقتوں سے ممکن نہ تھا۔

نقطوں اور حرکات کا وجود حافظہ میں

اب ہم اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں اس بات کو فرض کر کے کہ حضرت عثمانؓ نے جو مصحف لکھوائے تھے اُن پر نقطے اور حرکات نہ تھے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آیا نقاط اور حرکات کے نہ ہونے سے اختلاف قرات کا پیدا ہونا ممکن تھا۔ یہ ثابت ہو چکا کہ شروع سے حفاظت قرآن کریم کے دو سامان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کئے اور یہی دو سامان آپکے بعد بھی ہر وقت اور ہر زمانے میں اپنا کام کرتے چلے آئے۔ ایک قرآن کریم کے ہر ایک لفظ کا ضبط تحریر میں لایا جانا اور دوسرا اس کا سینوں میں محفوظ کیا جانا۔ یعنی تحریر اور حافظہ۔ جب حضرت ابوبکر کے وقت میں جمع قرآن کا کام کیا گیا تو اس وقت بھی اس دوہری شہادت سے کام لیا گیا۔ اور جس طرح قرآن کریم کے لکھے ہوئے نسخے دن بدن پھیلتے چلے جاتے تھے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ کثرت کے ساتھ قرآن شریف کے حفظ کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اس طرح حضرت عثمانؓ کے وقت میں ہزاروں حافظ قرآن شریف کے موجود تھے جن میں سے بعض تو وہ تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی زندگی میں قرآن کریم کو حفظ کر چکے تھے اور بعض وہ تھے جنہوں نے صحابہ رضؓ سے سیکھ کر حفظ کیا۔ اس لئے حضرت عثمان نے جب لکھے ہوئے نسخے باہر بھیجے تو بہنچے بھی حافظ کی شہادت کو ساتھ رکھتے تھے۔ کیونکہ قرآن کریم کے حافظ اسلامی دنیا میں ہر جگہ موجود تھے پس اگر بالفرض ان نسخوں پر نقطے اور حرکتیں نہ بھی تھیں تو اس سے کوئی حرج لازم نہیں آتا۔ کیونکہ قرآن کریم کی حفاظت جیسی تحریر میں تھی اسی طرح حافظہ میں بھی تھی۔ اگر کسی جگہ ایک نسخہ قرآن شریف کا لکھا ہوا پہنچا تو ہزاروں حافظ بھی موجود تھے اور حفاظت کے ان دونوں سامانوں کے ہوتے ہوئے کسی تغیر و تبدل کا واقع ہونا ناممکن تھا۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے جیسا کہ فتح الباری میں لکھا ہے کہ ابتدائی زمانہ اسلام میں قراتوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور بہت بڑی تعداد قراتوں کی بعد میں پیدا ہو گئی۔ ان قراتوں کا بعینہ وہی حال ہے جو حدیثوں کا یعنی دن بدن اُن کی کثرت ہوتی چلی گئی۔ امام بخاری نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے دو اڑھائی ہزار حدیث کو لیا اسی نسبت سے قراتوں کو جانچ لینا چاہئے۔ صحابیوں اور تابعین کے درمیان قرات کی روایت کرنے والے بہت ہی کم لوگ پائے جاتے ہیں۔ مگر بعد میں ایک ایسی قوم پیدا ہو گئی جنہوں نے قرات کو اپنا پیشہ بنا لیا اور بہت سی قراتیں جاننے کو فخر سمجھا اسی سے کثرت قرات کی شروع ہوئی۔ اس لئے کسی قرات کو قبول کرنے کے لئے اعلیٰ درجہ کی معتبر اور یقینی شہادت چاہئے۔ صرف مفسرین کے اقوال یا بعض قرا کے اقوال سے ایسی معتبر اور یقینی شہادت نہیں ملتی بلکہ صحیح احادیث سے ہی صرف ایسی شہادت مل سکتی ہے مگر یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کسی قرات کو صحیح حدیث سے کسی صحابی تک پہنچا دیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ قرات واقعی قرآن شریف میں بھی داخل ہے صحابہ رضؓ کے درمیان جو کچھ اختلاف مختلف حروف کی قرات کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اسکی حقیقت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس ساری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔ بلکہ جس طرح اس کلام پاک کو خدا نے اتارا اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضؓ کو اور ان مقدس بزرگوں نے بعد کی نسلوں کو پہنچایا۔ اور بلا شک و شبہ ایک حرف اس کا بغیر کسی کمی زیادتی یا تغیر تبدل کے وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا تھا +

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جس صورت میں مختلف قراتوں کا کسی زمانہ میں بھی رائج ہونا ثابت نہیں تو آخر ان قراتوں سے مراد کیا ہے سو جہاں تک میں نے غور کیا ہے بات صرف اس قدر معلوم ہوتی ہے کہ جہاں معنوں میں کوئی اہم تغیر پیدا ہونے کے بغیر ایک لفظ کسی اور طرح پر بھی پڑھا جا سکتا تھا اسی کو قرات کہہ دیا گیا ہے نہ کہنے والے کا یہ منشا تھا کہ وہ لفظ اس طرح پر نازل نہیں ہوا جس طرح پر لکھا ہوا قرآن میں موجود ہے اور نہ ہی کبھی یہ مطلب تھا کہ وہ لفظ دونوں طرح پر نازل

ہوا ہے اسلامی دنیا میں کسی شخص نے کسی جگہ ایک لمحہ کے لئے بھی کسی قرات کو یہ وقعت نہیں دی کہ قرآن کریم کے اصل لفظ کو نکال کر وہ قرات داخل کر دیتا۔ مثال سے یہ بات اور بھی واضح ہو سکتی ہے فاتحہ جیسی سورۃ جسے ہر نماز میں کئی دفعہ کھلے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے۔ اسکے اصل الفاظ کے متعلق کب کسی کو کوئی شک پیدا ہو سکتا تھا۔ مگر اس سورۃ میں بھی بعض قراتیں دی گئی ہیں۔ مثلاً ملك یوم الدین میں دو اور قراتیں مَلَكَ یوم الدین اور مَلِكِ یوم الدین بتائی جاتی ہیں۔ مطلب ان قراتوں کا صاف ظاہر ہے یعنی لفظ کی صورت کو بدلنے کے بغیر دو طرح پر اور یہ لفظ پڑھا جا سکتا ہے جس سے معنوں میں بھی کچھ فرق نہیں آتا۔ اب اس کے یہ معنی نہیں کہ کبھی اس بارے میں شک ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس لفظ کو کس طرح پڑھتے تھے۔ بلکہ لفظ اور معنی کے تغیر کے بغیر ایک صورت اسی لفظ کے ادا کرنے کی تھی۔ زیادہ سے زیادہ کسی قرات کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی اجازت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ مگر کسی قرات کو یہ مرتبہ دینے کے لئے مضبوط سے مضبوط شہادت بکار ہے جو اعلیٰ درجہ کی صحیح احادیث پر مبنی ہو۔ اور ایسی کسی قرات سے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں قرآن کریم کی اصل عبارتوں کی حفاظت میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ یہ اختیاری قراتیں تھیں۔ جن کی اجازت دی گئی اور ان کو واجب نہیں کیا گیا۔

اس تمام بحث سے یہ معلوم ہو گا۔ کہ جن معنوں میں اختلاف قرات کا لفظ عام طور پر بولا جاتا ہے اس مفہوم کے رو سے قرآن کریم میں در اصل کوئی اختلاف قرات نہیں۔ عام طور پر جب ہم کسی نسخہ یا کتاب کے اختلاف قرات کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے۔ کہ یہ امر مشتبہ ہے کہ اصل میں اس نسخہ یا کتاب میں فلاں عبارت تھی جو اس میں موجود ہے یا دوسری عبارت تھی جو بطور قرات ثانی پیش کی جاتی ہے قرآن کریم میں ایسا اشتباہ ہرگز نہیں۔ بلکہ یقین کامل کے ساتھ ہم کہہ سکتے ہیں جس کے متعلق قطعی شہادت اور بین ثبوت پیش کر دیا گیا ہے کہ اصل عبارت قرآن کریم کی وہی تھی جو آج بین الدفتین موجود ہے ایسا ہی اختلاف قرات سے بعض وقت مراد غلطی بھی ہوتی ہے یعنی مروجہ نسخہ میں کسی طرح سے کوئی غلطی راہ پا گئی ہے یا کوئی نقص رہ گیا ہے چنانچہ بائیبل وغیرہ کی کتابوں کے متعلق جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد انہی معنوں میں سے کوئی معنی ہوتے ہیں۔ جن کا ذکر ہم نے یہاں کیا۔ مگر قرآن کریم کے متعلق اس لفظ کا استعمال ان معنوں میں ہرگز درست نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم کے تمام نسخے جنہیں اسلامی دنیا نے قبول کیا ہے۔ ابتدا سے لیکر آج تک ایسی غلطیوں سے محفوظ رہے ہیں۔ اور تیرہ صدیوں سے ایک ہی نسخہ چلا آتا ہے جس کی حفاظت یقینی دلائل اور روشن شہادت سے ثابت ہے +

تمت

بیان القرآن یعنی اُردو تفسیر و ترجمۃ القرآن

مصنفہ حضرت مولانا مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے امیر جماعت احمدیہ لاہور

اس بے نظیر تفسیر کی چند ایک خصوصیات جو اُسے دوسری تفاسیر سے ممیز کرتی ہیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) قرآن کریم کے ایک مقام کو دوسرے مقام سے حل کیا گیا ہے (۲) قرآن کریم کی تفسیر کرنے میں احادیث صحیحہ کو دوسری باتوں پر مقدم کیا گیا ہے اور اس غرض کے لئے بخاری کی تفسیر کتاب التفسیر ابن جریر اور تفسیر ابن کثیر کو سامنے رکھا گیا ہے (۳) لغات قرآن کریم کی پوری تشریح کیگئی ہے جس کے لئے مفردات راغب تاج العروس اور لسان العرب سے مدد لی گئی ہے (۴) قرآن کریم کی ترتیب اور نظم کو خاص طور پر واضح کیا گیا ہے اول آیات قرآنی کا باہمی ربط۔ دوم رکوعوں کا باہمی تعلق۔ سوم سورتوں کا ایک دوسرے سے تعلق واضح طور پر بیان کیا گیا ہے (۵) ہر ایک سورت کے شروع میں اس کے تمام رکوعوں کا خلاصہ دیا گیا ہے اور اس سورت کے نام میں جو حکمت ہے اسے ظاہر کیا گیا ہے (۶) قرآن کریم کا ترجمہ لفظی مگر بامحاورہ کیا گیا ہے اور ترجمہ کو الفاظ کی حد سے نہیں نکلنے دیا۔ اپنی طرف سے الفاظ بڑھانے کے اصول کو بالکل ترک کر دیا گیا ہے۔ (۷) قرآن کریم کی لغات کے حل اور مطالب کی تشریح میں متقدمین کی آراء کو ساتھ ساتھ بیان کیا ہے اور کتب کا حوالہ بھی دیا گیا ہے (۸) اس تفسیر کی اصل غرض یہ ہے کہ لوگوں میں قرآن کریم کا شوق پیدا ہو۔ اور جو لوگ زبان اُردو لکھ پڑھ سکیں وہ اس تفسیر کی مدد سے خود قرآن شریف کا درس دے سکیں۔ اس لئے ہر ایک بات عام فہم عبارت میں واضح کی گئی ہے (۹) ہر ایک جلد کے شروع میں تفسیر کے مضامین کی مکمل فہرست دی گئی ہے۔

(۱۰) ان تمام باتوں کے ساتھ کتاب کی ظاہری خوبی کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ ہر ایک صفحہ کے شروع میں قرآن کریم نہایت اعلیٰ درجہ کا خوشخط بین السطور ترجمہ نیچے تفسیر۔ کاغذ نہایت اعلیٰ قسم۔ جلد نہایت خوبصورت اور مضبوط۔ پشت پر سنہری حروف میں کتاب کا نام اور جلد کا نمبر وسط میں سنہری طغریٰ (۱۱) تمام تفسیر تین جلدوں میں شایع ہوئی ہے۔ ہر ایک جلد کی ضخامت ۲۹×۲۲/۸ تقطیع کے سات آٹھ سو صفحات کے قریب ہے۔ پہلی جلد قیمت لعہ ر۔ محصولڈاک و خرچ پیکنگ عمہ ر۔ دوسری جلد قیمت للعہ۔ محصولڈاک وغیرہ عمہ۔ تیسری جلد قیمت لعہ۔ محصولڈاک وغیرہ عمہ مکمل رعایتی قیمت عـــہ ۲۵ علاوہ محصولڈاک ✦ (نوٹ) وی پی کی درخواست کے ہمراہ قیمت کا چوتھائی حصہ پیشگی آنا چاہئے ✦

تمام درخواستیں بنام **منیجر دارالکتب اسلامیہ احمدیہ بلڈنگس** لاہور آنی چاہئیں

دارالکتب اسلامیہ کی چند ضروری کتابیں

سیرت خیر البشر

شروع کتاب میں عرب کا نقشہ دیا گیا ہے۔ ملک عرب کی جغرافی حالت اور اس کا تعلق دوسرے ممالک و اقوام سے بتایا گیا ہے بعدہٗ تمام حصص زمین میں مذہبی تاریکی اور روحانی فیض کا مفقود ہونا آپ کی بعثت سے پہلے اور بعثت کے موقعہ پر کے چند بڑے بڑے نشانات کا ذکر کیا گیا ہے جو ظہور پذیر ہوئے اور پھر زمانہ بچپن سے لے کر آخر عمر تک کے حالات درج ہیں۔ اس بے نظیر تصنیف میں صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق فاضلہ پر محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاکہ بنی نوع انسان کے لئے بالعموم اور اہل اسلام کے لئے بالخصوص روزانہ عمل زندگی کے مختلف شعبوں میں مشعل راہ ہو۔ دوم ایڈیشن

قیمت بیجلد عہر + مجلد .... عہر

تاریخ خلافت راشدہ

یہ کتاب حال ہی میں حضرت مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے نے تصنیف فرمائی ہے۔ اس کتاب میں واقعات کے رنگ میں حضرت ممدوح نے ثابت کیا ہے کہ خلفاء راشدین کا زمانہ بھی دراصل زمانہ نبوی کا نتیجہ ہے۔ ہر ایک خلیفہ کا زمانہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خاص خلق کا ظہور تھا۔ اور خلافت راشدہ کے چار مختلف زمانے مسلمانوں کو چار عظیم الشان سبق دیتے ہیں جو ہر حالت میں ان کے خضر راہ ہیں۔

بہت سے اعتراضات جو غیر مسلم ناواقفیت یا تعصب کی وجہ سے اسلامی فتوحات پر کرتے ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے سے دور ہو جاتے ہیں۔ کتاب کے ساتھ خلفائے راشدین کی سلطنت اسلامی کا نقشہ بھی دیا گیا ہے۔ ملک کے اہل قلم اس کتاب کے متعلق اعلیٰ آراء رکھتے ہیں۔ ہر ایک مسلمان کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے

قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہر) بیجلد ایک روپیہ (عہر)

النبوۃ فی الاسلام

اس میں نبوت رسالت محدثیت۔ مجددیت اور حضرت مرزا صاحب مسیح موعود کی نبوت پر بحث کی ہے۔ قرآن شریف اور حدیث شریف اور مرزا صاحب کی کتب سے ثابت کیا گیا ہے کہ نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی اور حضرت مرزا صاحب نبی بمعنی محدث ہیں۔ آخر میں اس کتاب کے ضمیمہ دیا گیا ہے جس میں حضرت مرزا صاحب کی ان تمام تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے جن سے آپکا نبوت سے انکار کرنا ثابت ہوتا ہے۔

قیمت بیجلد عا + مجلد دو روپیہ آٹھ آنہ عہر

حدوث مادہ

ایک آریہ صاحب سے مباحثہ جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ مادہ حادث ہے۔ قیمت ۵ر

مقام حدیث

یہ تازہ تصنیف نہایت ہی قابل قدر ہے جس میں اہل قرآن کا مدلل اور فیصلہ کن جواب ہے اس میں علاوہ ضرورت حدیث کے جمع حدیث اور تنقید حدیث پر مفصل بحث ہے۔ ہر ایک شخص جسے آنحضرت صلعم کے اقوال کے ساتھ تفتیش منظور ہے اس کتاب کو ضرور پڑھے اس کتاب کو پڑھ کر حدیث کے متعلق تمام اعتراضات منح ہو جاتے ہیں۔ اس کے شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خط کا عکس دیا گیا ہو جو آپنے مقوقس شاہ مصر کو لکھا تھا۔ اس کا مطالعہ ہر مسلمان کیلئے ضروری ہو۔ قیمت بے جلد عہر + مجلد عہر

تمام درخواستیں بنام منیجر دار الکتب اسلامیہ احمدیہ بلڈنگس لاہو آنی چاہئیں

Presented to

Mr. Hussain B. Tyebjee

from:-

Esmail Adam, Bombay 2.

20/12/35.